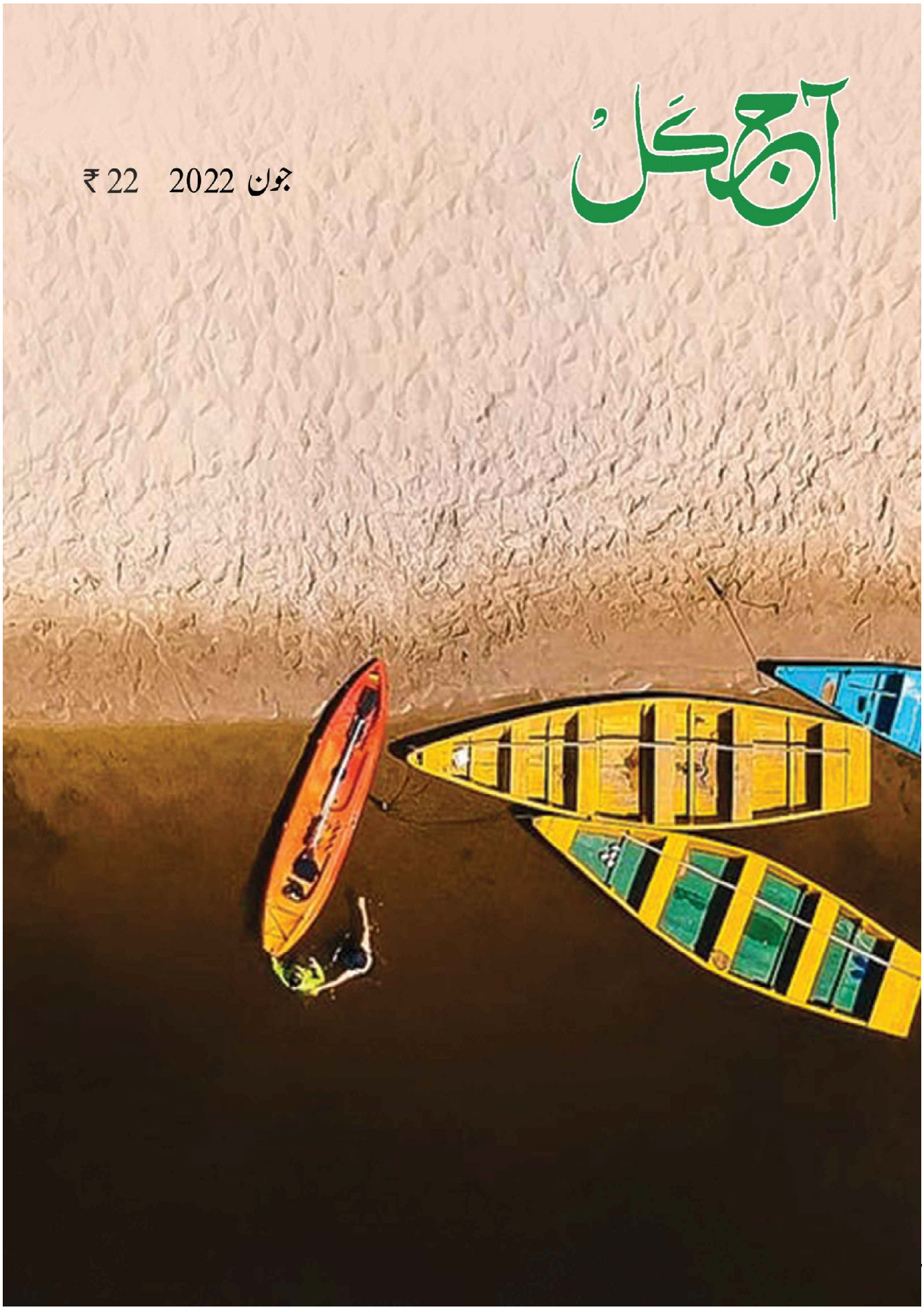
آجکل

جون 2022 ₹ 22



مسعود حسن رضوی ادیب **آجکل کی فائل سے: (جون 1975)**

میر انیسؔ: ایک مختصر تعارف

میر انیسؔ خاندانی شاعر تھے۔ان کے خاندان میں شاعری کئی پشتوں سے چلی آتی تھی۔ان کے مورث اعلیٰ میر امامی شاہجہاں کے عہد سلطنت میں ایران سے ہندوستان آئے اور اپنے علم وفضل کی بدولت سہ ہزاری ذات کے منصب پر فائز ہوئے۔وہ طبیعت کی موزونی سے کبھی کبھی شعر بھی کہتے تھے۔ان کی زبان فارسی تھی،لیکن دہلی کے مستقل قیام سے وہ ہندوستانی زبان سے متاثر ہوتی رہی اور دونسلوں کے بعد ان کی اولاد کی زبان دہلی کی فصیح وشستہ اردو ہوگئی۔ان کے پروتے میر ضاحکؔ اردو کے صاحبِ دیوان شاعر ہوئے۔ذیل کے دوشعروں سے ان کی زبان کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

درپیش اگر روز اجل آہ نہ ہوتا
قصہ تھا محبت کا یہ کوتاہ نہ ہوتا
کیا دیجئے اصلاح خدائی کو وگرنہ
کافی تھا ترا حسن اگر ماہ نہ ہوتا

میر ضاحکؔ اور مرزا سودا میں جو ہجو بازی ہوتی رہتی تھی،اس کا ذکر تقریباً ہر تذکرہ نویس نے کیا ہے۔

میر ضاحکؔ کے فرزند میر حسن اردو کے نامور شاعر تھے۔اردو میں سیکڑوں مثنویاں کہی گئیں،لیکن میر حسن کی مثنوی 'سحر البیان' کا جواب نہ ہوسکا۔وہ غزل بھی بہت اچھی کہتے تھے۔ان کی ایک غزل کے تین شعر سنئے:

مجھ میں اور دل میں سدا ہے سبقِ عشق کا درس
میں سناتا ہوں اسے اور وہ سناتا ہے مجھے
یاد میں کس کی کروں، مجھ کو کہاں ہوش و حواس
اپنی ہی یاد سے یہ عشق بھلاتا ہے مجھے
اتنا معلوم تو، ہوتا ہے کہ جاتا ہوں کہیں
کوئی مجھ میں ہے کہ مجھ سے لیے جاتا ہے مجھے

میر حسن کے تین بیٹے خلقؔ، خلیقؔ، مخلوقؔ شاعر تھے۔خلیقؔ اور خلقؔ صاحبِ دیوان تھے۔خلیقؔ کا شمار فن شاعری کے استادوں میں تھا۔رند اور رشکؔ جب تک فیض آباد میں رہے، میر خلیقؔ سے اصلاح لیتے رہے۔لکھنؤ آکر رندؔ، آتشؔ اور رشکؔ، ناسخؔ کے شاگرد ہوگئے۔میر خلیقؔ نے غزل گوئی سے بہت زیادہ شہرت مرثیہ گوئی میں حاصل کی۔شبلیؔ نے 'موازنۂ انیس ودبیر' میں، عبدالسلام نے 'شعر الہند' میں حامد حسن قادری نے 'تاریخ مرثیہ گوئی'' میں اور ابواللیث صدیقی نے 'لکھنؤ کا دبستان شاعری' میں لکھا ہے کہ خلیقؔ کے مرثیے دستیاب نہیں ہوتے، لیکن میرے عظیم ذخیرۂ مراثی میں خلیقؔ کے پونے دوسو مرثیے موجود ہیں۔

میر خلیقؔ کے تین بیٹے تھے انیسؔ، اُنسؔ، مونسؔ۔تینوں بلند پایہ شاعر اور نامور مرثیہ گو ہوئے۔لیکن میر انیسؔ نے مرثیہ کو اس بلندی پر پہنچادیا جہاں کسی دوسرے شاعر کی رسائی ممکن نہ ہوئی۔

میر انیسؔ کے پردادا میر ضاحکؔ، دادا میر حسن، والد میر خلیقؔ اور دو چچا میر خلقؔ اور میر مخلوقؔ سب شاعر تھے۔اس طرح میر انیسؔ کو شاعری اپنے بزرگوں سے میراث میں ملی تھی اور ان کی نشو ونما شاعری کی فضا میں ہوئی۔

میر حسنؔ عنفوان شباب میں اپنے والد میر ضاحکؔ کے ساتھ دہلی کی سکونت ترک کر کے فیض آباد میں مقیم ہوگئے تھے۔ان کے بیٹوں کا بھی مستقل قیام فیض آباد ہی میں رہا۔اسی شہر میں میر انیسؔ 1218ھ (1803ء) میں پیدا ہوئے۔تعلیم وتربیت بہت اچھی پائی۔معتبر لوگوں کی روایتیں اور خود ان کا کلام بتاتا ہے کہ ان کو عربی اور فارسی پر عبور اور اپنے زمانے کے مروجہ علوم سے کافی واقفیت تھی۔قدرت نے ان کو اپنی معلومات سے کام لینے کا حیرت خیز سلیقہ بھی عطا کیا تھا۔

انیسؔ نہایت مہذب اور متین آدمی تھے، دوسروں کے حفظ مراتب اور تالیف قلب کا حد درجہ خیال رکھتے تھے۔فرماتے ہیں:

خیال خاطر احباب چاہئے ہر دم
انیسؔ ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

ایسی طبیعتیں جو دوسروں کے ساتھ بدتہذیبی روا نہیں رکھتیں، خود اپنے ساتھ کیوں کر روا رکھیں گی؟ یہی سبب تھا کہ انیسؔ میں خوش مزاجی کے ساتھ نازک مزاجی بھی تھی۔ان کی نازک مزاجی اس وقت اور بڑھ جاتی تھی جب وہ منبر پر بیٹھے ہوئے اپنا کلام اہل مجلس کو سنا رہے ہوں۔اس وقت ان پر ایک محویت کا عالم طاری ہوتا تھا اور وہ اپنے کمال کے نشے میں سرشار ہو کر اس بلندی پر پہنچ جاتے تھے جہاں سے بے کمالی کا درجہ، خواہ وہ ریاست وامارت کا لباس ہی کیوں نہ پہنے ہو، بہت پست معلوم ہونے لگتا ہے۔

خود داری، عزت نفس، قناعت اور استغنا انیسؔ کی سیرت کی بہت نمایاں خصوصیتیں تھیں۔انیسؔ کے زمانے کے امرا نہایت خوشامد پسند تھے اور انیسؔ کا گزارا انہی کی داد ودہش پر تھا۔مگر وہ بھری مجلسوں میں ان کے منہ پر اپنی قناعت، خود داری اور بے نیازی کا ذکر، نتائج کی طرف سے آنکھیں بند کر کے، اس شان سے کر دیتے تھے کہ ان کا بیان خود ان کے دعوؤں کی دلیل ہو جاتا تھا۔چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

کنج عزلت میں مثالِ آسیا ہوں گوشہ گیر
رزق پہنچاتا ہے گھر بیٹھے خدا میرے لیے
کریم جو تجھے دینا ہے بے طلب دے دے
فقیر ہوں، پہ نہیں عادتِ سوال مجھے
بخشی ہے خدا نے ہم کو وہ دولتِ فقر
برسوں ڈھونڈھے تو بادشاہ کو نہ ملے
دہان کیسہ زر بند رکھ پر اے منعم
خدا کے واسطے وا کر جبیں کے چینوں کو
جز خدا جھکتے نہیں ہم بادشاہ کے سامنے
ہاتھ پھیلائے تو نگر کیا گدا کے سامنے
در پہ شاہوں کے نہیں جاتے فقیر اللہ کے
سر جہاں رکھتے ہیں سب ہم واں قدم رکھتے نہیں

انیسؔ نے اردو شاعری کو 'تنگ نائے غزل' سے نکال کر بے پایاں وسعت بخشی۔قدرت نے ان کو تفکر، تخیل، مشاہدہ اور بیان کی جو عدیم المثال قوتیں عطا کی تھیں ان کے اظہار کے لیے انہوں نے واقعۂ کربلا کا سا عظیم موضوع منتخب کر کے رزمیہ، رثائیہ، بیانیہ اور اخلاقی شاعری کے میدانوں میں وہ معجزنمائیاں کیں جنہوں نے ہماری شاعری کو زمین سے آسمان پر پہنچا دیا۔انیس کا یہ دعویٰ سرتاسر صداقت پر مبنی ہے۔

(بقیہ 51 صفحہ پر)

میکشؔ اکبرآبادی

قدم قدم پہ ملک مجھ پہ بھیجتے ہیں سلام
رہِ فنا میں چلا لے کے میں حسینؑ کا نام
خدا کا نام نہ لیتا کوئی زمانے میں
اگر نہ لیتے دمِ ذبح وہ خدا کا نام
بھلائے کیسے جنابِ انیسؔ کو وہ شخص
کرے جو ذکرِ امامِ حسینؑ عرش مقام
جواب مل نہ سکا شرق وغرب میں جس کا
جلائی مشعل خورشید، صبح نے تا شام
حسینؑ حسینؑ کے نعروں سے دشت ودر گونجے
کچھ اس خلوص سے اس نے لیا حسینؑ کا نام
وہ سوگوارِ شہیداں، غریق حب حسینؑ
علیؑ کی نسل کا مداحِ اہلبیت عظام
امیرِ لفظ و معانی، فصیح سحر بیاں
زباں کنیز، مضامین اس کے گھر کے غلام
کسی سے نقل بھی اس کے کلام کی نہ بنی
وہ بے مثال سخنور وہ مرثیے کا امام
'قبول خاطرِ لطفِ سخن' خدا کی ہے دین
ہے فیض آل نبی کا جسے ملے یہ مقام
انیسؔ تم بھی ہو مداحِ آل، میکشؔ بھی
سلام تم پہ، تمہاری طرف سے مجھ پہ سلام

اردو کا بین الاقوامی ادبی اور ثقافتی ماہنامہ

آجکل

نئی دہلی

جلد:80 شمارہ:11

جون 2022 جیٹھ۔اساڑھ شک 1942

ایڈیٹر : فرحت پروین

اعزازی مدیر : حسن ضیاء

فون : 011-24369189

معاون : نرگس سلطانہ

کمپوزنگ : آئی احمد

سرورق : نشانت پٹیل

پروڈکشن آفیسر: ڈی کے سی ہردہی ناتھ

آجکل کے مشمولات سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں

فی شمارہ:22روپے

رجسٹرڈ ڈاک سے سالانہ:434روپے

دوسال:838روپے تین سال:1222روپے

خریداری واشتہار کے لیے منی آرڈر، ڈرافٹ اور پوسٹل آرڈر ADG, Publications Division کے نام اس پتہ پر بھیجیں:

Editor (Business)

Publications Division

7th Floor, Soochna Bhawan, CGO Complex,

Lodhi Road, New Delhi-110003

فون نمبر:011- 24367453

رسالے کی عدم دستیابی سے متعلق شکایتیں شعبہ کو مندرجہ ذیل آئی ڈی پر میل کریں

pdjucir@gmail.com

مضامین/تخلیقات سے متعلق رابطے کا پتہ:

Editor Ajkal (Urdu)

Publications Division 601-A Soochna Bhawan

CGO Complex, Lodhi Road, New Delhi-110003

e-mail: ajkalurdu@gmail.com

website: www.publicationsdivision.nic.in

@DPD_India @dpd_India

@publicationsdivision

ترتیب

ملاحظات : اردو صحافت اور اردو اسکول حسن ضیاء 4

مضامین

اردو میں ادبی ڈرامے کی روایت اور اس کا تعین — پروفیسر ابوبکر عباد 5

دہلی شناسی پر اہم مطبوعات — ڈاکٹر رضاء الرحمٰن عاکف سنبھلی 8

اردو اور گوجری زبان کا لسانی اشتراک: ایک جائزہ — غلام مصطفیٰ اشرفی 11

مذہب، فلسفہ اور ادب — ڈاکٹر احسان حسن 15

سریندر پرکاش کی اساطیری کائنات — محمد عارف 18

یادرفتگاں

شمس الرحمٰن فاروقی کی یاد میں — ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی 21

وہ جو ماہ وانجم تھے اردو کی کائنات کے — عمران عاکف 26

پروفیسر سید اقبال علی — عفت آرا 29

طنزو مزاح

کڑوی روٹی — ڈاکٹر اعجاز پاپولر میرٹھی 31

افسانے

تلاش — وحشی سعید 33

ماسٹر جی — دیپک بدکی 35

رکشہ والا — اقبال حسن آزاد 37

پھول اور خوشبو — ڈاکٹر ریاض توحیدی کشمیری 39

عطر دان — پروفیسر افسانہ خاتون 41

منظومات

پی پی سریواستو رندؔ، ڈاکٹر فریاد آزار، اخلاق آہن 44

ف۔س اعجاز، رضوان کشفی، جوہر نوری 45

قیصر الہ آبادی، مسلم نواز، ڈاکٹر محمد داؤد نور 46

تبصرے 47

مبصر

دیکھ لی دنیا ہم نے/غضنفر — دائم محمد انصاری

مٹی کے موسم/بلراج بخشی — حبیب سیفی

مجھے بھی/غزالہ قمر اعجاز — ڈاکٹر ظفر عالم

پرواز /جمشید کمال — جمال عباس فہمی

ہر روز روز عید/احتشام الحق — ابرار احمد اجراوی

وفیات: 51

مراسلات 54

اردو صحافت اور اردو اسکول

گزشتہ شمارے میں یہ بات زیر غور آئی تھی کہ اردو کے اخبارات ورسائل کو انگریزی اور دیگر زبانوں کے بعض اخبارات کی طرح اسکول وکالج کے طلبا سے براہ راست ربط پیدا کرنا ہوگا تاکہ مستقبل قریب میں جو نئے قاری بن سکتے ہیں ان تک وقت سے پہلے ہی پہنچ کر رابطہ قائم کیا جائے۔ آج اسکول اور کالج کے بچوں کو بھی نصاب کے علاوہ مطالعہ کے لیے معیاری کتب، رسائل اور اخبارات کی جانب راغب کرنا ضروری ہے۔ بچوں کے ذہنی نشو ونما میں نصاب کے علاوہ دیگر مواد کا مطالعہ بے حد ضروری ہے۔ آج علم اور معلومات جس رفتار سے بڑھ رہی ہے، کسی کے لیے بھی اس سے ہم قدم رہنا آسان نہیں ہے۔ طالب علم کا پہلا فرض نصاب پر عبور حاصل کرنا ہے لیکن خود کو نصاب تک محدود رکھنا آج کسی بھی طالب علم کے لیے آگے کے کیریئر کے اعتبار سے سودمند نہیں ہوگا۔ ایسے میں اسکول کالج کے طلبا کی اچھے اور معیاری ادب اور معلومات تک رہنمائی کرنا ضروری ہے۔ ماہنامہ 'آجکل' بھی اس سلسلے میں اقدامات کررہا ہے۔ اس کا بنیادی مقصد علم ومعلومات پر مبنی سماج یعنی نالج سوسائٹی کی تشکیل دینا ہے۔ آج نالج سوسائٹی کا تصور یہ بھی ہے کہ ہمارے پاس جو معلومات ہیں اسے ایک پیداواری ذریعہ کے طور پر بروئے کار لایا جائے۔ پہلے پیداوار کے ذرائع خام مال تک ہی محدود تھے لیکن آج علم و معلومات بھی معاشیات کی اصطلاح میں پیداوار کے ذرائع میں شامل ہے جسے بروئے کار لاکر ہم ایک اچھا معاشرہ تشکیل دے سکتے ہیں۔ سوشل میڈیا سے آج کے طلبا اور نوجوانوں کی دلچسپی فطری امر ہے لیکن سوشل میڈیا کا غلط استعمال، قیمتی وقت کے زیاں کا سبب بھی بن سکتا ہے۔ ایسے میں معیاری ادب اور معیاری کتابیں، رسائل اور اخبارات کو نظر انداز کرکے سارا وقت اور توانائی سوشل میڈیا یا ڈیجیٹل ذرائع ابلاغ پر غیر ضروری اور فضول چیزوں میں صرف کردینا بھی صحیح نہیں ہوگا۔ یہ بات طلبا کے ذہن میں بٹھانی ضروری ہے اور بڑوں کو بھی سمجھنی ہوگی۔ آج جب ملک میں اور دنیا بھر میں خواندگی کی شرح مسلسل بڑھ رہی ہے اور اپنے بچوں کی تعلیم کے حصول کے لیے لوگ سرگرداں ہیں، ایسے میں مقابلہ اور بھی بڑھ جاتا ہے اور اس میں بالآخر کامیابی اسی طالب علم کو ملے گی جو اپنے نصاب پر عبور رکھنے کے ساتھ نصاب سے باہر کے علم ومعلومات میں سچی دلچسپی رکھتا ہو اور اس کے حصول کے لیے محنت بھی کرے۔

اردو اخبارات، رسائل اور ابلاغ عامہ کے دیگر ذرائع کے ذمہ داروں کا بھی یہ فرض ہے کہ وہ طلبا کو بھی اپنا قارئین سمجھیں اور ان تک پہنچنے کا کوئی کارگر راستہ نکالیں۔

اردو کے بعض اخبارات مقابلہ جاتی امتحانات اور کیریئر کے مواقع پر مضامین شامل کرتے ہیں۔ اس سلسلے کو بھی عام کرنے کی ضرورت ہے۔ آج روزگار کے بازار کے جو مطالبات ہیں ان کو طلبا کی صلاحیتوں سے ہم آہنگ کرنے میں پیغام رسانی اور ترسیل کا کام اردو میڈیا اچھے طریقے سے کرسکتا ہے۔ اگر اردو اخبارات ورسائل میں اس طرح کے کالم شامل ہوں گے تو ان کی افادیت کو محدود دائرے میں ہی صحیح پذیرائی ضرور ملے گی۔

آج ایک خیال یہ بھی ہے کہ اردو اخبارات عمر رسیدہ لوگ ہی پڑھتے ہیں۔ نوجوانوں کو ان اخبارات سے زیادہ سروکار نہیں ہے۔ یہ بات ہم برسوں سے سنتے رہے ہیں جب آج کے بزرگ بھی نوجوان یا بچے تھے۔ لہٰذا اس بات کو بھی ایک حد تک ہی صحیح مانا جائے گا۔ لیکن اس چیز کو غلط ثابت کرنے کے لیے نہ صرف اردو اخبارات بلکہ اردو خبر رساں ایجنسیوں، اردو صحافیوں اور مصنفین کو بالخصوص عصر حاضر کے موضوعات پر صحافتی تحریریں قلم بند کرنے والے مصنفین کو آج کی نئی نسل کو اردو صحافت سے جوڑنے اور اردو صحافت کو ان کے لیے پرکشش بنانے کی کوشش کرنی ہوگی ہر چند کہ اس طرح کے مشورہ دینے کے مقابلے عملاً یہ کام کرنا آسان نہیں ہے۔ لیکن مقاصد کا حصول کتنا ہی دشوار کیوں نہ ہو اگر ان کو پیش نظر رکھ کر محنت کی جائے گی تو کامیابی کے راستے بھی پیدا ہوتے ہیں۔ نئی نسل کے لیے اردو صحافت کی معنویت کو از سر نو تلاش کرنا ہوگا اور نوجوانوں کی دلچسپی بالخصوص روزگار کے مواقع اور روزگار کے حصول میں مددگار موضوعات اور معلومات کو بھی اردو صحافت کا حصہ بنانا ضروری ہے۔ روزگار کے مواقع میں خود روزگار اور سرکاری اور نجی شعبہ، غیر منظم شعبہ سب کچھ شامل ہونا چاہئے۔ اردو صحافت کے موضوعات کے تعین میں اس طرح کی تبدیلی یا اضافے پر تمام اہل نظر کو غور کرنا چاہئے۔ تاکہ اسکول کالج کے طالب علم بھی خود کو اردو صحافت سے وابستہ کرسکیں اور انہیں محسوس ہو کہ وہ ایسے مواد کا بھی مطالعہ کررہے ہیں جو آگے زندگی میں ان کے کام آسکتا ہے۔

آج معلومات کے منظر نامے پر رونما ہونے والی تیز رفتار تبدیلیوں میں سب سے بڑا مسئلہ یہی ہے کہ زیادہ تر طالب علم اس صلاحیت اور ہنرمندی کے حامل نہیں ہیں جس کی روزگار کے بازار کو ضرورت ہے۔ یہ ضرورت بھی تیز رفتاری سے بدل رہی ہے۔ گزشتہ کل روزگار کے حصول کے لیے جو صلاحیت درکار تھی وہ آج یکسر بے معنی ہوچکی ہے۔ آج کے مطالبات بالکل الگ ہیں۔ اس میں ٹیکنالوجی کی تیز رفتار ترقی کو بھی بڑا دخل ہے لہٰذا نئی تبدیلیوں پر ماہرین کی آراء حاصل کرکے ان کو طلبا تک پہنچانے میں اردو میڈیا بھی اپنا رول ادا کرسکتا ہے۔

حسن ضیاء

ابوبکر عباد



اردو میں 'ادبی ڈرامے' کی روایت اور اس کا تعین

'**ادبی** ڈراما' کی اصطلاح اگر غلط نہیں ہے تو اسے بہت زیادہ صحیح بھی نہیں کہا جاسکتا، کہ ڈراما بذات خود افسانوی اصناف میں سے داستان، ناول اور افسانے کی طرح ایک اہم صنف ہے۔ بقول گوئٹے ناول اور ڈرامے میں فرق یہ ہے کہ ناول میں 'جذبات' 'واقعات' پیش کیے جاتے ہیں اور ڈرامے میں 'کردار' اور 'کارنامے'۔ یعنی ناول میں 'واقعہ' Narration (بیانیہ) کی صورت ہوتا ہے اور ڈرامے میں Performance (عملیہ) کی صورت۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ داستان، افسانے اور ناول کے واقعات بالعموم صیغۂ ماضی میں بیان کیے جاتے ہیں، جب کہ ڈرامہ لازمی طور پر زمانہ حال میں ہو رہا ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ ناول یا افسانے میں بھی ڈرامائی صورت پیش کرنے کے لیے ناول نگار یا افسانہ نگار اسے زمانۂ حال کے صیغے میں بیان کرتا ہے۔ تیسرا فرق یہ کہ ناول یا افسانے کا راوی زمانے، جائے وقوع، کیفیت اور احوال کی تفصیلات اپنے نقطۂ نظر سے بیان کرتا ہے جس کی وجہ سے قاری یا سامع راوی کے نقطۂ نظر کا پابند ہو جاتا ہے۔ اس کے مقابلے ڈرامے میں سب کچھ آنکھوں کے سامنے ہو رہا ہوتا ہے، لہٰذا ڈرامے کا ناظر ناول کے قاری کی طرح راوی کے نقطۂ نظر کا پابند نہیں، پوری طرح آزاد ہوتا ہے۔ یوں ناول کے مقابلے ڈرامے میں تعبیر (Interpretation) کی گنجائش کہیں زیادہ پیدا ہو جاتی ہے۔

اب چونکہ ہمارے یہاں اسٹیج ڈراما، ریڈیو ڈراما اور ٹیلی ڈراما کی اصطلاحیں اپنے اپنے زمانے میں رائج ہوتی رہی ہیں اس لیے ادبی ڈراما کی بھی اصطلاح سازی کی گئی۔ مگر ہمارے ناقدین اس اصطلاح یا اس کی تعریف کے تعین میں ابہام کا شکار رہے۔ کچھ نے ادبی ڈراما انہیں قرار دیا جو ادیبوں اور شاعروں سے متعلق ڈرامے ہیں، کچھ نے ان ڈراموں کو ادبی کہا جن کے مکالموں اور واقعات میں ادبی عناصر پروئے گئے اور بعضوں نے اُن ڈراموں پر اس اصطلاح کا اطلاق کیا جو صرف پڑھنے کے لیے تحریر کیے گئے۔ اب چونکہ ڈراما خود ادب کی ایک صنف ہے لہٰذا اس کے لیے ادبی ڈراما کے بجائے 'کتابی ڈراما' یا 'تحریری ڈراما' کی اصطلاح ہونی چاہیے۔ لیکن اگر اصرار 'ادبی ڈراما' کی اصطلاح پر ہی ہے تو پھر پڑھنے کے لیے لکھے جانے والے ڈراموں کو ادبی ڈرامے سے تعبیر کرنا زیادہ مناسب رہے گا۔ ڈاکٹر انور سدید نے بھی تحریری یعنی رسالوں اور کتابوں میں شائع ہونے والے ڈرامے کو ادبی ڈراما ہی کہا ہے۔ یہ تحریر ملاحظہ کیجیے:

''اسٹیج، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ڈرامے اپنی اپنی نوع کے اعتبار سے ایک مخصوص فنی تکنیک کا تقاضہ کرتے ہیں۔ ادبی ڈراما میں تخلیقی اور تمثیلی لطف، واقعات اور حادثات کا اثر و عمل اور جذبہ و کیف کا جزر و مد مطالعے کے دوران ذہنی سطح پر پیدا ہوتا ہے۔ اس قسم کے ڈرامے کی اپنی الگ خصوصیات ہیں اور اس میں لکھنے والے کو نسبتاً زیادہ تخلیقی آزادی حاصل ہے۔... کھیلے جانے والے ڈراما سے کہیں زیادہ پڑھا جانے والا ڈراما لکھا گیا اور جب اچھے ڈراموں کی ضرورت محسوس کی گئی تو اسی ڈرامے کو اسٹیج کے لیے بھی استعمال کیا گیا۔'' (اردو ادب کی مختصر تاریخ، ص 638، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، پاکستان، 1991)

بہر حال آیئے اس حوالے سے آگے کی گفتگو ڈرامے کے آغاز سے کرتے ہیں۔ کہنے کی ضرورت نہیں کہ عالمی سطح پر ڈراما ایک پاور فل میڈیم رہا ہے اور بالعموم انٹلکچوئل اور عوام کے کامیاب ہتھیار کے طور پر مذہبی دیوانگی، نظری استبداد اور سیاسی جبر و استحصال کے خلاف استعمال ہوتا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زمانۂ قدیم میں اٹلی کے پوپ کا استبداد، فرانس میں پادریوں کی شدید مخالفت اور انگلستان میں پیورٹین فرقہ کی شورشیں اس کا مقابلہ کرنے سے قاصر رہیں۔ ہمارے عہد میں صفدر ہاشمی کے نکڑ ناٹک، حبیب تنویر کے اسٹیج ڈرامے اور محمد حسن کا تحریر کردہ ڈراما 'ضحاک' اس کی مثال کے طور پر پیش کیے جاسکتے ہیں۔

ابتداءً ڈرامے کو ادب کی ایک شاخ کے طور پر قبول کرنے کے لیے ہمارے عالموں نے مین میکھ نکالنے کے بعد بادل نخواستہ خود کو آمادہ کیا۔ اردو تو جانے دیجیے، خود سنسکرت کے علما بھی ابھیکیان شاکنتلم، مدرا راکشسا، مرچھکٹی اور پرتما ناٹک وغیرہ کو بالکل ایسے ہی پڑھتے پڑھاتے تھے جیسے ہمارے مکتبوں میں انوار سہیلی اور گلستاں بوستاں پڑھی پڑھائی جاتی تھیں۔ قدامت پسند اردو معاشرہ ڈرامے کو گناہ بھری شک کی نظروں سے دیکھتا تھا اور جدید اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات اردو ڈرامے سے اس لیے نالاں اور اس کے شاکی رہے کہ وہ ان کا تقابل بن جانسن، شیکسپیئر، برنارڈ شا اور بریخت سے کر کے اسے کم مایہ اور حقیر جانتے رہے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ اردو زبان و ادب کی تاریخ میں شاعری، فکشن، علمی مضامین اور تحقیق و تنقید کے مقابلے ڈرامے کی روایت ہمیشہ سے نادار رہی اور آج بھی اس کے ذخیرے کی حیثیت کسانوں کے مودی خانوں سے زیادہ نہیں ہے۔ ظاہر ہے اس کی کئی وجوہ ہیں۔ مثلاً پہلی تو یہ کہ اردو میں جتنی اصناف موجود ہیں سوائے دوڈھائی کے سب کی سب دوسری زبانوں اور دوسرے ممالک سے درآمد کی ہوئی ہیں۔ بیشتر کلاسیکی اصناف ہمارے یہاں فارسی سے آئی ہیں اور ایک دو اصناف جو عربی کی ہیں وہ بھی فارسی کے توسط سے ہی اردو کی اقلیم میں داخل ہوئی ہیں۔ یعنی ابتداءً ہم نے جن اہم اصناف کو لے پالک بنایا وہ سب کی سب یا تو عجمی تھیں یا پھر عربی۔ مثلاً قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، غزل، رباعی، قطعہ، حکایت، داستان، تمثیل، تحقیق اور تنقید وغیرہ۔ تو سوال یہ ہے کہ جس زمانے میں ہم نے 'آتم نربھر' بننے کا سبق نہیں سیکھا تھا اور عرب و عجم کی ادبی اصناف کا اپنے ہی طور پر پرائیوٹائزیشن کرنے میں مصروف تھے تو پھر ڈراما جیسی دلکش اور دلچسپ صنف کیوں چھوڑ دی؟ اس کا سیدھا سا جواب یہ ہے کہ تب عربی اور فارسی میں اس کی کوئی مستحکم روایت موجود نہ تھی۔ خود اپنے یہاں سنسکرت میں لاثانی ڈرامے موجود تو تھے لیکن بے چاری سنسکرت زبان اردو کے بچپنے سے پہلے ہی بستر مرگ پر جا چکی تھی اور اس کے ڈرامے عہد قدیم کا محض حوالہ بن کر رہ گئے تھے۔ سو، اس کی تقلید کا کوئی جواز نہ تھا۔ پھر اردو کا جن دوسری زبانوں سے تعلق تھا وہاں بھی خیریت ہی خیریت تھی۔ چنانچہ ڈرامے کی متاع بے بہا سے فیضیاب ہونے کے لیے اردو زبان اور معاشرے کو کافی عرصے تک ایک نئی یا کہیے انگریزی تہذیب و تمدن کا انتظار کرنا پڑا۔

گو کہ انگریزوں کے مکمل تسلط سے ذرا پہلے اودھ کے ایک بے حد تعلیم یافتہ، ذہین اور

شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی
فون: 9810532735 bakarabbad@yahoo.co.in

جدت پسند بادشاہ حضرت واجد علی شاہ اور آغا حسن امانتؔ وغیرہ ڈرامے کی صورت رہس کو پیش کرتے رہے تھے مگر فی الاصل یہ ڈرامے نہ تھے، رہس ہی تھے۔ جو ناقدین حضرات انھیں ابتدائی اردو ڈرامے ماننے پر مصر ہیں، ان کی مرضی۔ اڑتی ہوئی چیل کو جہاز کی ابتدائی شکل ماننے والوں کا بھی ہم نے یا سائنسدانوں نے بھلا کیا بگاڑ لیا۔

بہر حال انگریزوں اور انگریزی ادب سے جب ہماری ذرا بے تکلفی ہوئی تو ہم نے اپنے ہی ملک کی کھوئی ہوئی صنف کو اپنے حاکموں کے توسط سے از سر نو پانے کی کوششیں کیں اور یوں پارسی تھیٹر کمپنیوں کو خوش آمدید کہنے میں کوئی جذباتی کسر نہ چھوڑی۔ دراصل اردو ڈرامے کی ابتدائی شکل ان کمپنیوں کو ہی کہنا چاہیے۔ ان کے ڈراما نگاروں میں احسن، آغا اور بیتاب کی ڈرامے میں ادبی خدمات لائق قدر ہیں۔ ان تینوں حضرات کے انشا کا طرز اور اسلوب الگ الگ تھا۔ مثلاً احسن کی تحریروں میں سوز و گداز کا وفور تھا، آغا حشر کے مکالمے بلند آہنگ اور اثر انگیز تھے اور بیتاب کی تحریریں شکوہ و جلال سے آراستہ ہوتی تھیں۔ لیکن فنی لحاظ سے ڈرامائیت ان سب کے یہاں یا تو نہیں یا پھر بہت ہی کم تھی۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ تھیٹر کمپنی کے منیجر ناظرین کی پسند کے تحت کہانی کے خاکے خود تیار کرتے، جن کی بنیاد پر ڈراما نویس کہانی لکھتے اور میوزک ماسٹر انھیں گانوں سے سجاتے تھے۔ اس مثلث فارمولے کے تحت ہمارے ابتدائی ڈرامے لکھے اور کھیلے گئے۔ اب ایسی صورت حال میں ڈراموں سے فن کی مکمل پابندی، ادب کی چاشنی، فکری بلندی اور ایک مخصوص معیار کی توقع رکھنا زیادتی ہی کہی جاسکتی ہے۔ بالکل یہی صورت حال آجکل ہمارے نیوز چینلوں، بلکہ رویش کمار کی اصطلاح میں 'گودی میڈیا' کا ہے، کہ کانٹینٹ (مواد) بزنس مین مالک طے کرتے ہیں، اسکرپٹ اس کی مرضی کے ایڈیٹر لکھتے ہیں اور اینکر زا چھل کود مچا کر اور چیخ چلا کر اپنے ناظرین کو جذباتی آسودگی پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ (یہاں یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ تھیٹر کمپنیوں کا مقصد بھی کافی حد تک ڈرامے کو مجرا کرنے والی خواتین کے رقص و نغمے اور بہروپیوں کی نقالیوں کا قائم مقام بنا کر عام لوگوں کو تفریح مہیا کرانا اور بدلے میں پیسے کمانا تھا) گو کہ احسن، حشر اور بیتاب اسٹیج سے قطع نظر ذاتی ادبی حیثیتوں کے بھی مالک تھے، لیکن وہ حضرات بھی پیسوں کے حصول والی بھیڑ سے خود کو الگ نہیں رکھ پائے، بالکل ویسے ہی جیسے ہمارے عہد کے بعض ذہین ادیب اور اساتذہ اہم اور عظیم علمی و ادبی کارنامے انجام دینے کے بجائے سمیناروں، ویبیناروں اور کانفرنسوں میں اپنی صلاحیتوں کو عارضی شہرت اور معمولی رقم کے عوض بھٹکاتے اور خود کو بہلاتے رہتے ہیں۔

یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ آغا حشر نے اپنے عہد کے تمام لکھنے والوں سے بہتر ڈرامے تحریر اور اسٹیج کیے۔ انھوں نے قدیم روایت سے قدرے انحراف کر کے ڈرامے میں تفریحی عناصر کو کم کیا، اس میں اعتدال و توازن کی صورت نکالی، موضوعات میں جدت پیدا کی اور ادبی محاسن پر توجہ دے کر ڈرامے کے معیار کو کافی حد تک بلند کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ڈراموں میں فکری عنصر، تخیل کی فراوانی، ادبی چاشنی، لہجے کی متانت، خوبصورت نظم و نثر، مبالغے کی گھن گرج، جذبات کی عمدہ عکاسی اور دلکش مکالمے واضح طور پر دیکھے جاسکتے ہیں۔

ڈرامے کے کمتر معیار کی دوسری وجہ یہ رہی کہ شروع میں اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات تھیٹر یا ڈراما نگاری کے میدان میں آنے سے بچتے رہے، جس کے نتیجے میں اسٹیج عام طور سے کم اہلوں کے ہاتھ میں رہا۔ پھر یہ کہ تعلیم یافتہ، مہذب اور بلند مذاق لوگ ڈرامے دیکھنے سے بھی پرہیز کرتے تھے چنانچہ تھیٹر والوں کو چاہتے یا نہ چاہتے ہوئے بھی پست مذاق اور سطحی فکر و خیال کے لوگوں کی پسند کے ڈرامے لکھنے اور کھیلنے پڑتے تھے۔

ڈرامے کے کمتر معیار کی تیسری اہم وجہ یہ رہی کہ اس عہد کے بڑے ادیبوں نے ڈرامے لکھنے کی جانب خاطر خواہ توجہ نہیں دیا اور جن لوگوں نے لکھے بھی تو تبدیلی مذاق کے لیے یا اپنی اضافی صلاحیتوں کے اظہار کے طور پر لکھے۔ جب کہ عالمی سطح پر نظر ڈالیے تو پشکن، میکسم گورکی، انتون چیخوف، گوئٹے اور جان ملٹن وغیرہ نے ڈرامے لکھنے میں زیادہ سنجیدگی، شوق اور باضابطہ پن کا مظاہرہ کیا ہے۔ مختلف علوم و فنون پر دسترس رکھنے والے اپنے عہد کے ہمارے بڑے اور اہم ادیب جیسے ڈپٹی نذیر احمد، پنڈت رتن ناتھ سرشار، مولانا محمد حسین آزاد، خواجہ الطاف حسین حالی، مولانا امداد امام اثر اور علامہ شبلی نعمانی وغیرہ اس صنف کی طرف توجہ دیتے تو ڈرامے کی صورت حال کو سدھرتے اور اسے معیاری بنتے اتنی تاخیر نہ ہوتی۔ یا یوں کہیے کہ ہمارے یہاں اچھے اور معیاری ڈراموں کی تخلیق ایک ایسے عہد میں نہیں ہو رہی ہوتی جس عہد میں یہ صنف تنگیِ اوقات اور نئے تفریحی ذرائع کے باعث بے توجہی کا شکار ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ آجکل عمدہ ڈراموں کی بھی ویسی پذیرائی نہیں ہو پا رہی ہے جیسی ہونی چاہیے۔

ابتدائی اردو ڈرامے میں منشی ونایک پرشاد طالبؔ بنارسی کا ڈراما 'لیل و نہار' اہم اور معیاری ہے، طالب بنارسی نے اپنے وقت میں ایک جدت یہ کی کہ انگریزی دھنوں پر اردو گانے باندھے۔ اب یہ الگ بات ہے کہ 1980 میں ریلیز ہونے والی فیروز خان کی فلم قربانی کے لیے نازیہ حسن کے گائے ہوئے گانے 'آپ جیسا کوئی مری زندگی میں آئے تو بات بن جائے' کو لوگ انگریزی دھن پر پہلا اردو/ہندی گانا سمجھ کر اس پر ایسے فریفتہ ہوئے کہ اس گانے نے مقبولیت کا ایک نیا ریکارڈ قائم کیا۔

اردو ڈرامے کو قابل قبول حیثیت دینے اور اسے باضابطہ ایک سنجیدہ ادبی فن تسلیم کرنے کا آغاز تب ہوا جب دارالعلوم دیوبند کے فاضل، سرسید علیہ الرحمہ کے نیاز مند اور رسالہ 'تہذیب نسواں' کے مدیر مولوی ممتاز علی کے صاحبزادے امتیاز علی تاج نے ڈراما 'انارکلی' تحریر کیا۔ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس ڈرامے نے مہذب اور تعلیم یافتہ لوگوں کے دلوں میں جگہ بنائی، ادب کی ایک شاخ کے طور پر اس کی شناخت عام ہوئی اور اردو میں ڈراما نگاری کے ایک نئے عہد کی بنیاد پڑی۔ یوں کہ انارکلی سے پہلے اردو میں ڈرامائی پیش کش کے دو واضح اسلوب رائج تھے۔ ایک امانت لکھنوی اور مداری لال کا اندر سبھائی اسلوب اور دوسرا آغا حشر کے نام سے جانا جانے والا پارسی تھیٹر کا اسلوب۔ دونوں اسلوبوں میں تفریح، سطحی جذبات انگیزی اور ایک نوع کی سوقیت، یا کہیے بازاروادجاوی تھے۔ انارکلی کے ذریعے اردو ڈرامے میں ایک تیسرے اسلوب کی بنیاد پڑی، جس میں حقیقت و تخیل کی آمیزش، متین لہجے، شگفتہ زبان، تجسس و تحیر اور تصادم و کشمکش کی مدد سے بڑا ہی نستعلیق قسم کا ادبی اسلوب خلق کیا گیا۔ یوں امتیاز علی تاج اور انارکلی نے ڈراما نگاری کے آرٹ کو ایک نئی جہت اور نئے دور سے آشنا کیا۔

یہ کہنا شاید غلط نہ ہو کہ یہ وہ زمانہ تھا جب اردو ڈراما اسٹیج سے کافی حد تک اپنا رشتہ توڑ کر ادب کی دوسری اصناف مثلاً ناول اور افسانے کی طرح پڑھی جانے والی صنف کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ یہ حقیقت بھی نشان زد رہنی چاہیے کہ اسٹیج کے ڈراموں میں خالص ادبی شان پیدا کرنے کا خیال امتیاز علی تاج سے پہلے مرزا محمد ہادی رسوا، مولوی عبدالحلیم شرر، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا ظفر علی خاں اور پنڈت چکبست وغیرہ کو آیا تھا اور انھوں نے اس کے لیے عملی کوششیں بھی کی تھیں۔ اس حوالے سے مرزا محمد ہادی رسوا کے ڈرامے 'مرقع لیلیٰ مجنوں'، مولوی عبدالحلیم شرر کے 'شہید وفا' اور 'میوۂ تلخ'، مولانا محمد حسین آزاد کے 'اکبر'، مولانا عبدالماجد کے 'زود پشیماں' اور مولوی ظفر علی خاں کے 'جنگ روس و جاپان'، پنڈت برج نرائن چکبست کے 'کملا' اور پنڈت دتاتریہ کیفی کے ڈرامے 'راج دلاری' کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ اسٹیج کے تقاضوں سے بے پروا ہو کر، مختلف موضوعات پر لکھے گئے یہ تمام ڈرامے فنی اعتبار سے کمزور اور ادبی لحاظ سے معیاری کہے جاسکتے ہیں۔ اب چونکہ یہ کوشش ڈرامے کو اسٹیج پر دیکھنے کے بجائے ڈرائنگ روم اور لائبریری میں بیٹھ کر پڑھے جانے والے ادبی ڈرامے سے جوڑنے کی تھی، اس لیے اس میں ڈرامائی تکنیک کی پابندی اور تفریحی عناصر سے زیادہ زبان و بیان اور مقصدیت پر زور دیا گیا۔ چنانچہ اس رجحان کی بڑے پیمانے پر تقلید ہوئی اور خاصی تعداد میں ایسے ڈرامے لکھے اور شائع کیے گئے، گو کہ بعد میں ان ڈراموں میں سے بہت سے اسٹیج پر پیش کیے گئے، ٹیلی ویژن پر دکھائے گئے اور ریڈیو پر نشر ہوئے۔

ترقی پسند تحریک نے دوسری اصناف کی طرح ڈرامے پر بھی خصوصی توجہ دی تھی۔ اس عہد میں جن ادیبوں نے ڈرامے لکھے ان میں راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، خواجہ احمد

عباس، رامانند ساگر اور عصمت چغتائی، ریوتی سرن شرما کے نام بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ منٹو نے ڈرامے ریڈیو کے لیے تحریر کیے تھے جن میں زیادہ تر کی نوعیت ہلکے پھلکے طنز و مزاح اور شگفتگی طبع کی ہے، تاہم یہ ڈرامے باعتبار زبان و بیان ادبی شان سے مزین ہیں۔ عصمت کے ڈرامے کمزور ہیں، واضح طور پر محسوس ہوتا ہے کہ ڈرامے کی تکنیک ان کے قابو میں نہیں آ رہی ہے، البتہ بیدی کے ڈرامے بطور فن اور موضوع عمدہ ہیں، کہنے کی ضرورت نہیں کہ فلمی دنیا سے وابستگی کی بنا پر انھوں نے اس صنف میں خاطر خواہ فائدہ اٹھایا ہوگا۔ ان کے دونوں مجموعے 'بے جان چیزیں' اور 'سات کھیل' کے ڈرامے سماجی اور تہذیبی صورت حال کو بیان کرنے کے ساتھ ادبی آسودگی بھی بخشتے ہیں۔

اسٹیج، فلم اور ریڈیو سے منسلک افراد کی طرح یونیورسٹیز سے وابستہ حضرات نے بھی ڈرامے لکھے اور مختلف ذرائع سے اس کی پیش کش میں دلچسپیاں لیں۔ پروفیسر محمد مجیب نے ڈرامے خوب لکھے اور مختلف علمی، مذہبی، معاشرتی، سیاسی، تاریخی، سوانحی اور نفسیاتی موضوعات کو ان کا تانا بانا بنایا۔ 'کھیتی'، 'انجام'، 'ہیروئن کی تلاش'، 'حبہ خاتون'، 'دوسری شام'، 'آزمائش'، 'خانہ جنگی' اور 'آؤ ڈراما کریں' ان کے اہم ڈرامے ہیں۔ ان میں موضوعاتی اعتبار سے 'دوسری شام' نفسیاتی ڈرامہ ہے، 'آزمائش' 1857 کے پس منظر میں ہندوستانی فوج کی بغاوت کے حوالے سے لکھا ہوا المیہ ڈرامہ ہے۔ 'خانہ جنگی' سلطنت مغلیہ کے پس منظر میں اورنگزیب اور دارا شکوہ کے مابین کش مکش پر مبنی ہے۔ اور 'آؤ ڈراما کریں' اور 'ہیروئن کی تلاش' ہلکے پھلکے دلچسپ ڈرامے ہیں۔ لیکن ان میں سے بیشتر ڈراموں کی زبان اور طریقۂ اظہار ادبی ہے۔

پروفیسر اعجاز حسین نے طلبہ کے لیے یونیورسٹی میں اسٹیج کرنے کے لیے 'خواجہ آتش'، 'مجاز'، 'سید انشا' اور 'اکبر الہ آبادی' کے عنوان سے چار ڈرامے لکھے جو اسٹیج ہونے کے بعد 'ادبی ڈرامے' کے نام سے مجموعے کی شکل میں شائع ہوئے۔ ان ڈراموں میں شاعر کی شخصیتوں کے مختلف پہلوؤں کو ادبی نقطۂ نظر سے پیش کیا گیا ہے۔ جنگ اور امن کے پس منظر میں تحریر کردہ پروفیسر اختر اورینوی کا ڈراما 'شہنشاہ حبشہ' اس اعتبار سے قابل ذکر ہے کہ اس میں ادبیت بدرجۂ اتم موجود ہے، پروفیسر زاہدہ زیدی اور پروفیسر عشرت رحمانی نے بھی اپنے ڈراموں میں ادبی لوازم و اسلوب کا خاص طور سے خیال رکھا ہے۔ پروفیسر زاہدہ زیدی کے ڈراموں کے مجموعے 'طبع زاد ڈرامے' کے علاوہ متعدد عالمی شہرت یافتہ ڈراموں کے ترجمے ان کی تصانیف میں اہم حیثیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے کئی ڈرامے اسٹیج بھی کیے ہیں۔

پروفیسر شمیم حنفی نے بھی خاصے ڈرامے تحریر کیے ہیں۔ ان کے دستیاب ڈراموں کے دو مجموعے ہیں: ایک 'مٹی کا بلاوا'، دوسرا 'مجھے گھر یاد آتا ہے'۔ پہلے مجموعے میں یہ ڈرامے شامل ہیں: مٹی کا بلاوا، دھوپ کی دستک، کھویا ہوا لمحہ، خلا کے باشندے، جزیروں سے آگے، پانی پانی۔ دوسرے مجموعے کے ڈراموں کے نام ہیں: پانچویں سمت، اپنی اپنی زنجیر، چوراہا، پانی بہہ رہا ہے، مجھے گھر یاد آتا ہے۔ ان میں سے دو ایک ڈرامے اسٹیج ہوئے ہیں، چند ٹیلی ڈرامے کی شکل میں پیش کیے گئے اور کچھ ریڈیو سے نشر شدہ ہیں۔ ظاہر ہے ان ڈراموں میں فنی اصول و ضوابط کے ساتھ فکر و خیال، زبان و بیان اور ادبی معیار پر بطور خاص توجہ دی گئی ہے۔

ابھی چند مہینے پہلے پروفیسر صادق کا ڈراما 'اس شکل سے گزری غالب' شائع ہوا ہے۔ یہ ڈراما اگرچہ مستند تاریخوں کی روشنی میں مرزا غالب کے حالاتِ زندگی اور ان کی شخصیت کی متعدد جہات کا احاطہ کرتا ہے مگر پروفیسر صادق نے ڈراما نگاری کے اصولوں کو برتتے ہوئے جس سہل انداز، شگفتہ زبان، رواں بیانیے اور خوبصورت اسلوب میں اس ڈرامے کو پیش کیا ہے اسے ادبی ڈرامے کی عمدہ مثالوں میں شمار کرنا چاہیے۔ یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ یونیورسٹیز کے اساتذہ میں جس شخص نے ڈرامے کے فنی اصول و ضوابط، اس کی تکنیک، اس کی نزاکتوں اور اس میں تفریح طبع کے ساتھ ساتھ مقصدیت اور ادبیت کی آمیزش کا جیسا خیال پروفیسر محمد حسن نے اپنے ڈراموں میں رکھا ہے اس کی مثال دوسرے اساتذہ کے یہاں شاذ ہے۔ حسن صاحب نے ریڈیو فیچر سے اسٹیج ڈرامے تک کا سفر کیا ہے۔ ان کے ڈراموں میں 'مور پنکھی'، 'پیسہ اور پرچھائیں'، 'کہرے کا چاند'، 'تماشا اور تماشائی'، 'نقش فریادی' اور 'ضحاک' قابل ذکر ہیں۔ آخر الذکر ڈرامے کا شمار اردو کے چند بیحد اہم اور عمدہ ڈراموں میں ہوتا ہے۔ یہ اولاً ان کے رسالے 'عصری آگہی' میں قسط وار شائع ہوا، پھر اسٹیج پر پیش کیا گیا اور بعد ازاں کتابی شکل میں شائع ہوا۔ کہتا چلوں کہ مذہبی جنون اور سیاسی جبر کے مسائل پر ہمارے یہاں بہت ہی کم ڈرامے لکھے گئے ہیں۔ سیاسی جبر کے مسئلے پر اردو میں غالباً اب تک کا سب سے کامیاب اور اچھا ڈراما محمد حسن صاحب کا 'ضحاک' ہی ہے جو ایمرجنسی کے پس منظر اور پیش منظر کو علامت یا تلمیح کے طور پر فن میں ڈھالتا ہے۔

ہمارے عہد میں کئی ایک عمدہ ڈرامے ان لوگوں نے لکھے ہیں جو عملی طور پر ڈراما نگاری کے فن اور اسٹیج سے وابستہ ہیں یا رہے ہیں۔ ان لوگوں کے ڈرامے گو کہ مختلف موضوعات کو محیط ہیں مگر ان کی پیش کش، فضا بندی، خیال آمیزی، استعاروں اور علامتوں کے استعمال، طنز و مزاح کی آمیزش اور بطور خاص ان کے مکالموں میں ایک مخصوص ادبی شان نمایاں ہے۔ ان میں ظہیر انور، زماں حبیب، جاوید دانش، شاہد انور، انیس اعظمی، سعید عالم اور اظہر عالم کے نام اہم اور قابل ذکر ہیں۔ یہ سبھی لوگ عملی طور پر اسٹیج سے منسلک رہ چکے ہیں، سعید عالم اب بھی فعال ہیں۔ اقبال نیازی، نور ظہیر اور اسلم پرویز کے ڈرامے بھی کئی ادبی خوبیوں سے آراستہ ہیں۔ ظہیر انور ڈراما کے فن، اس کی تکنیک اور تاریخ سے متعلق کئی کتابوں کے مصنف ہیں، اچھے نقاد اور متعدد ڈراموں کے خالق ہیں۔ انھوں نے بہت سے ڈرامے اسٹیج کیے، ڈراموں میں ایکٹنگ کی اور ہدایت کاری کے فرائض انجام دیے ہیں۔ فی زمانہ ظہیر انور اردو ڈراما کے بڑے عالم اور فن شناس تسلیم کیے جاتے ہیں۔ زماں حبیب کے ڈراموں کا پہلا مجموعہ 'آدھی رات کا سورج' کے نام سے منظر عام پر آیا تھا، ملک کے مختلف حصوں میں ان کے ڈراموں کے شوز ہو چکے ہیں۔ زماں حبیب نے اسٹیج ڈرامے، ریڈیو ڈرامے اور ادبی ڈراموں کی تخلیق کے علاوہ اردو اور عالمی فکشن نگاروں کی کئی اہم کہانیوں کو بھی ریڈیو ڈرامے کا روپ عطا کیا ہے۔ اسٹیج ڈرامے میں بھی انھوں نے کئی کامیاب تجربے بھی کیے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ان کے ڈرامے 'جنتا ایکسپریس' اور منٹو کے افسانے پر مبنی 'ٹوبہ ٹیک سنگھ' کافی مقبول رہے ہیں۔ زماں حبیب اے۔ ایم۔ یو ڈراما کلب کے سکریٹری رہ چکے ہیں۔ انھوں نے متعدد ڈرامے تخلیق کرنے کے علاوہ اسٹیج کے حوالے سے بہت سے افراد بھی پیدا کیے۔ ان کی سکریٹری شپ کا زمانہ اب بھی اے۔ ایم۔ یو ڈراما کلب کے عہد زریں کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان دنوں زماں حبیب متعدد ٹیلی ویژن سیریلز کے پروڈیوسر، ڈائریکٹر اور رائٹر ہیں۔

جاوید دانش، انیس اعظمی اور سعید عالم ڈراما کے فن اور اسٹیج کے وہ اہم نام ہیں جو ڈراموں کے عمدہ خالق اور عملی طور پر اسٹیج سے منسلک ہیں۔ یہ تینوں حضرات ڈرامے کی فنی تکنیک کے ماہر، اسٹیج کی نزاکتوں کے رمز شناس، اچھے ایکٹر اور ہدایت کار ہونے کے علاوہ ڈرامے کے بہت ہی اچھے ناقد بھی ہیں۔ دلچسپ، خوبصورت اور معلوماتی گفتگو میں انیس اعظمی کا جواب نہیں۔ جاوید دانش دلکش اور شگفتہ نثر لکھنے میں اپنا جواب آپ ہیں۔ ان ڈرامائی مجموعوں میں 'ہجرت کے تماشے' خاصی اہمیت کا حامل ہے۔ سعید عالم بے حد عمدہ اداکار، ہدایت کار اور عمدہ شعری اور ادبی ذوق کے حامل ہیں۔ موجودہ عہد میں اردو کے اسٹیج ڈراموں کو سعید عالم نے جس بلندی پر پہنچایا، اسے اس کا کھویا ہوا وقار دلایا اور اس فن میں نئے رنگ و آہنگ کی آمیزش کی، اسے ان کے اہم کارنامے سے تعبیر کرنا چاہیے۔ ان کے اسٹیج ڈراموں میں تاریخی اور طنز و مزاح کے عناصر ان کی امتیازی شناخت ہیں۔

ڈرامے کے عمومی مطالعے کے بعد اس نتیجے کے اظہار میں کوئی باک نہیں کہ یہ صنف ابتدائی زمانے کی کم مائیگی سے نکل کر ترقی اور تجربے کے متعدد مراحل طے کر کے ادب کی دوسری اصناف کے مدمقابل آ کھڑی ہوئی ہے۔ مختلف النوع موضوعات کے احاطے، فکر و فلسفے کے بیان، نازک مسائل کے اظہار، جذبات و نفسیات کی عکاسی اور ادبی زبان و اظہار کے لحاظ سے یہ صنف ایسے موسم میں اپنے عروج کی طرف بڑھ رہی ہے جس میں بیشتر ادبی اصناف عوامی بے توجہی کا شکار ہیں۔ ☆☆

ڈاکٹر رضاء الرحمٰن عاکف سنبھلی



دہلی شناسی پر اہم مطبوعات

اردو زبان و ادب کی یہ خوش نصیبی رہی ہے کہ اس نے ہمیشہ ہی عوام و خواص میں مقبولیت حاصل کی ہے۔ اور عوام الناس سے لے کر مخصوص حلقوں نیز سرکاری ایوانوں میں پذیرائی حاصل کی ہے۔ مختلف ریاستوں کے حاکم رہے ہوں یا پھر الگ الگ علاقوں کے رؤسا۔ سب نے ہی اردو کو گلے لگایا۔ انگریزی دور کے افسران ہوں یا پھر آزاد ہندوستان کے حکمراں۔ ہر ایک نے ہی اردو کی توسیع و ترویج و اشاعت میں حصہ لیا ہے۔ اس سلسلے میں ملک کے تعلیمی اداروں میں اردو کے شعبوں کا قیام۔ تحقیقی کمیٹیاں اور مختلف تصنیفی اداروں کے ساتھ ہی ملک کی مختلف ریاستوں میں اردو اکادمیوں کا قیام بھی بطور خاص دیکھا جا سکتا ہے۔ قدامت کے اعتبار سے اگرچہ اتر پردیش اردو اکادمی کو اوّلیت کا درجہ حاصل ہے مگر کارکردگی اور خدمات کی حیثیت سے دہلی اردو اکادمی بھی ممتاز مقام کی حامل ہے۔ اس کے رسائل 'ایوانِ اردو' اور 'بچوں کا امنگ' اپنے مواد و طرز و اسلوب ہر ایک وجہ سے ہی ملک کے اہم رسائل میں شمار کئے جاتے ہیں۔ یہاں پر ضروری ہے کہ اس اکادمی کا مختصر تعارف کرا دیا جائے۔

دہلی اردو اکادمی کے قیام کا مقصد اردو کی ترقی و ترویج کے ساتھ ہی دہلی میں اردو کی صورتِ حال اور اس کی بقاء و ترویج کا جائزہ لینا اور اس کی توسیع و اشاعت کے فرائض انجام دینا تھا۔ دہلی اردو اکادمی کے دائرۂ کار میں اردو کی خدمات کے ساتھ ہی دہلی شناسی اور یہاں کی تہذیب و ثقافت کو متعارف کرانا بھی ہے۔ اس لئے اس کے مقاصد میں دہلی کے ادبی ماحول اور تہذیبی سرمائے کو محفوظ کرنا اور شائقین تک پہنچانا بھی ہے۔ جیسا کہ اس سلسلے میں اردو اکادمی کے سکریٹری زبیر رضوی صاحب نے لکھا ہے:

> ''ہندوستان کے مختلف صوبوں میں قائم اردو اکادمیوں میں دہلی اردو اکادمی اس لئے زیادہ ہی زیرِ بحث رہتی ہے کہ وہ دار الخلافہ دلّی میں سرگرم عمل ہے۔ اور ایک طرح سے ایک ماڈل کے طور پر کام کرنے کی کوشش میں لگی ہے۔ اس اکادمی کا دائرۂ کار خاصہ متنوع اور وسیع ہے۔ اس کے بنیادی مقاصد میں دلّی شہر کی ادبی تاریخ کو اس کی ثقافتی اور سماجی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر میسر اور دستیاب تاریخی اور دستاویزی مواد کو مرتب کرنے اور اسے کتابی صورت میں محفوظ کرنے کی سرگرمی خاص طور سے شامل ہے۔''

(زیرِ عنوان، حرفِ آغاز ہند اسلامی فن تعمیر، ص 21)

اقتباس بالا سے واضح طور پر مترشح ہوتا ہے کہ دہلی اردو اکادمی کے مقاصد کیا ہیں۔ ان کے علاوہ اس اکادمی کا ایک اہم کام اپنے موضوع پر دستاویزی حیثیت رکھنے والی کتابوں کی اشاعت تو بھی ہے جس کے پیشِ نظر اکادمی کا مقصد دہلی کی عظمت رفتہ اور اس کی تہذیب و ثقافت کے نقوش زرّیں کو محفوظ کرنا ہے۔ اس سلسلے میں اکادمی کے میسّر شریف الحسن نقوی اس طرح رقمطراز ہیں:

> ''اردو اکادمی، دہلی کی تعلیمی کمیٹی نے پچھلے سال فیصلہ کیا کہ ان کتابوں کے نئے ایڈیشن شائع کئے جائیں جو دہلی کی تہذیبی اور سماجی زندگی پر بہت پہلے لکھی گئی تھیں۔ اور جو اب بالکل نایاب ہو چکی ہیں۔ ان کتابوں کی مدت سے ضرورت محسوس کی جا رہی تھی۔ اس سلسلے میں ایک اشاعتی کمیٹی تشکیل دی گئی اور مختلف حضرات سے درخواست کی گئی کہ وہ ان کتابوں کے نئے ایڈیشن تیار کریں۔''

(دہلی کی آخری شمع، زیرِ عنوان، پیش لفظ)

یہ بات تو واضح ہو ہی چکی ہے کہ دہلی اردو اکادمی کے قیام کا مقصد اردو زبان و ادب کی ترویج کے ساتھ ہی دہلی شہر کے تعارف اور یہاں کی تہذیب و ثقافت سے واقف کرانا بھی تھا۔ چنانچہ اسی مقصد کے تحت اکادمی نے کچھ ایسی اشاعتی خدمات انجام دیں جن کے توسط سے اس کے زیرِ بحث مقاصد کی تکمیل ہو سکی ہے۔ اس سلسلے میں اکادمی نے بہت سی کتابوں کی اشاعت کی۔ جن میں کچھ خاص کتابوں کا ذکر یہاں کیا جا رہا ہے۔

۱۔ **واقعات دار الحکومت دھلی**: مولوی بشیر الدین احمد کی تحریر کردہ یہ کتاب دہلی شناسی کے تعلق سے بڑی اہم ہے۔ جو تین ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن شمسی پریس آگرہ سے 1919 میں شائع ہوا تھا۔ جو جلد ہی ختم ہوا اور پھر یہ کتاب نایاب ہو چکی تھی۔ جس کو دوبارہ منظر عام پر لا کر دہلی اردو اکادمی نے ہم اردو والوں پر بڑا احسان کیا کہ دہلی شناسی کے ایک مستند مآخذ سے روشناس کرایا۔

اس کتاب کی پہلی جلد میں دہلی کی تاریخ از ابتدا تا حکمران فرنگ پیش کی گئی ہے۔ جس میں مذکورہ عہد کے حالات و واقعات نہایت تفصیل اور شرح و بسط کے ساتھ تحریر کئے گئے ہیں۔ دوسری جلد میں دہلی کی عمارات، محلے، کٹرے، حویلیاں، مساجد، قلعے، درگاہیں، باؤلیاں، مقبرے، خانقاہیں وغیرہ کا ذکر نہایت ہی تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔ ساتھ ہی ان کے نقشے اور خاکے وغیرہ بھی پیش کئے ہیں۔ جن سے عمارات کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ اس کتاب میں زیادہ تر معلومات سرسید کی کتاب ''آثار الصنادید'' سے لی گئی ہے۔ مگر قابلِ ذکر اضافے کے ساتھ۔ ایک طرح سے بشیر صاحب نے سرسید کے کام کو آگے بڑھایا ہے۔ اور جو مقامات سرسید سے ذکر کرنے سے رہ گئے تھے۔ انہیں بھی اپنی کتاب میں شامل کر لیا ہے۔ ایک طرح سے یہ کتاب دہلی شناسی کے تعلق سے مستند ترین مآخذ کہا جا سکتا ہے۔ اگرچہ اس سلسلے میں اوّلیت تو سر سید کی کتاب ''آثار الصنادید'' کو ہی حاصل ہے۔ مگر تفصیل و وضاحت کے اعتبار سے یہ بھی دہلی شناسی کا بہت اہم ماخذ قرار دی گئی ہے کیوں کہ اس کتاب میں ایک طرح سے دہلی کی تاریخ بھی ہے۔ اور اس کا تفصیلی تعارف بھی۔

مولوی بشیر الدین احمد کا اسلوب نگارش اتنا دل پذیر ہے کہ یہ کتاب تاریخ جیسے خشک موضوع پر ہونے کے باوجود بھی قاری کو اس کا مطالعہ بارِ خاطر نہیں گزرتا اور وہ کتاب کے مطالعے کے وقت ایسا محسوس کرتا ہے گویا وہ دہلی کے تعلق سے کتاب پڑھ نہیں رہا ہے بلکہ خود بہ نفسِ نفیس

میاں سرائے، سنبھل (یوپی)
9837826809, Akif.sambhali@gmail.com

دہلی کی سیر کر رہا ہے۔ یعنی یہ کتاب دہلی شناسی کے تعلق سے پوری طرح مستند و مقبول کتاب ہے۔ جگہ جگہ عمارات کے نقشے، جدول، چارٹ وغیرہ نے بھی اس کی مقبولیت میں اضافہ کیا ہے۔ غرض یہ کہ یہ ہر طرح سے دہلی شناسی کے تعلق سے ایک دستاویز اور انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت کی حامل ہے۔

۲۔ **آثار الصنادید**: سرسید کی یہ وہ مایۂ ناز کتاب ہے۔ جس نے خود مصنف کو بامِ شہرت پر پہنچانے کے ساتھ ہی ''دہلی'' شہر کو بھی زندہ و جاوید کر دیا ہے کہ اس کتاب میں دہلی کا ذکر اتنی خوبصورتی، دلچسپی اور اہتمام و انصرام سے کیا ہے۔ گویا ایک کتاب میں دہلی کے تمام علاقوں، گوشوں اور تمام اعلام و اکناف کو اس طرح سمیٹ کر رکھ دیا ہے گویا کہ پوری دہلی ہی اس میں سما گئی ہے۔ اگر چہ اس کتاب کے دیگر ایڈیشن مختلف اداروں سے بھی شائع ہوئے مگر دہلی اردو اکادمی نے ۲۰۰۰ء میں شائع کر کے دہلی شناسی کے تعلق سے اپنی اشاعتی اسکیم کا حصہ بنالیا۔ چنانچہ اسی ضمن میں یہاں پر اس کتاب کا ذکر کیا جا رہا ہے۔

اس کتاب کے کل چار ابواب ہیں۔ جن کا تعارف اس طرح ہے۔

باب اوّل: دہلی کی عملداریوں کے مختصر حالات

باب دوم: دہلی میں قلعوں کے بننے اور شہروں کے آباد ہونے کے بیان میں

باب سوم: بادشاہوں اور امیروں کی متفرق بنائی ہوئی عمارتوں کے بیان میں

باب چہارم: دلّی اور دلّی کے لوگوں کے بیان میں

ضمیمہ: کوچہ و بازار و مکانات متفرق شہر شاہجہاں آباد کے بیان میں

مذکورہ بالا فہرست سے بآسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ کتاب دہلی شناسی کے تعلق سے کس درجہ اہمیت کی حامل ہے۔ پھر اس پر مستزاد یہ کہ جگہ جگہ متعلقہ عمارات کے نقشہ جات بھی دے دئے گئے ہیں۔ جن سے عمارات کو سمجھنے میں سہولت و آسانی ہو جاتی ہے۔ اسی کے ساتھ ہی مختلف قسم کے جدول اور چارٹ وغیرہ بھی اس کتاب کی افادیت میں اضافہ کا باعث ہیں۔ جن کے ذریعے متعلقہ معلومات کو نہایت اختصار میں سمجھنے کا موقع مل جاتا ہے۔ اور آنکھوں کو زیادہ مطالعے کی صعوبت برداشت کرنا نہیں پڑتی۔ اس کتاب کے زیر نظر ایڈیشن کو جدید انداز پر شائع کیا گیا ہے۔ اسی وجہ سے اشاریہ (Index) بھی شامل کر دیا گیا ہے۔ جس کے ذریعے بیان کردہ اشخاص و مقامات کو بآسانی تلاش کیا جا سکتا ہے۔

اس کتاب کو تصنیف کرنے میں سرسید کو بڑی صعوبت و محنت برداشت کرنا پڑی تھی اور اس کی اشاعت میں اپنے گھر کا قیمتی اثاثہ بھی فروخت کرنا پڑ گیا تھا۔ مگر یہ کتاب تصنیف کر کے انہوں نے اہلِ اردو پر جو احسان عظیم کیا اور دہلی شناسی کے تعلق سے جو شاہکار پیش کئے وہ رہتی دنیا تک ان کا نام روشن رکھیں گے۔ اسی کے ساتھ ہی ''دہلی اردو اکادمی'' بھی ستائش کے قابل ہے کہ اس نے اس کتاب کو اپنی اشاعتی اسکیم میں شامل کیا۔

۳۔ **ہندی۔ اسلامی فنِ تعمیر**: دہلی شناسی کے تعلق سے صہبا وحید کی تصنیف کردہ یہ کتاب بھی دہلی اردو اکادمی کی اچھی اشاعتی کاوش ہے۔ جس کے ذریعے دہلی کو سمجھا جا سکتا ہے۔ یہ کتاب دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس میں ۹ باب ہیں۔ جن کی تفصیل اس طرح ہے:

باب 1۔ اسلامی فنِ تعمیر کا تہذیبی پس منظر

باب 2۔ ہندی۔ اسلامی فنِ تعمیر کا ارتقاء

باب 3۔ ہندی۔ اسلامی تعمیر کا آغاز۔ اسلوب شاہی کا پہلا مرحلہ

باب 4۔ اسلوب شاہی کا دوسرا مرحلہ۔ خلجی سلاطین کی تعمیرات

باب 5۔ اسلوب شاہی کا تیسرا مرحلہ۔ سلطان غیاث الدین تغلق کے عہد کی تعمیرات

باب 6۔ سلطان محمد عادل تغلق شاہ کی تعمیرات

باب 7۔ اسلوب فیروزی۔ سلطان فیروز شاہ کی تعمیرات

باب 8۔ اسلوب شاہی کا چوتھا مرحلہ۔ سید اور لودی سلاطین کی تعمیرات

باب 9۔ شیر شاہ سوری کی تعمیرات۔ لودی اسلوب کا فروغ

جیسا کہ مرقومہ بالا فہرست سے مظہر ہے کہ اس کتاب کے ہر باب میں الگ الگ بادشاہوں کی تعمیرات کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس سے قاری کو مطلوبہ معلومات تلاش کرنے میں سہولت رہتی ہے۔ اور اسی سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ دہلی کو بنانے، سجانے، سنوارنے اور آراستہ کرنے میں تقریباً یہاں کے ہر ایک خاندان اور اس سے وابستہ بادشاہ نے ہی اپنی خدمات انجام دی ہیں۔ پھر ان معلومات کو یکجا کر کے صہبا وحید صاحب نے اور اس کتاب کو شائع کر کے دہلی اردو اکادمی نے ہم اردو والوں پر احسان عظیم فرمایا ہے۔

اس کتاب میں بھی مقامات کے فوٹو دئے گئے ہیں۔ یہ تصاویر کیمرے کے ذریعے لی گئی ہیں۔ اور نہایت صاف ہیں۔ جن سے عمارات کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ اس کتاب مین بھی دہلی کی تاریخ اور یہاں کی عمارات کا بڑے خوبصورت انداز میں ذکر کیا گیا ہے۔ اس لئے یہ کتاب بھی دہلی شناسی میں خاص رول ادا کرتی ہے۔ اور قارئین کو دہلی کے تعلق سے بڑی اہم و مفید معلومات فراہم کرتی ہے۔ کتاب میں دئے گئے اشاریہ (Index) سے متعلقہ و مطلوبہ معلومات کو تلاش کرنے میں سہولت رہتی ہے۔ اور بآسانی اس کو تلا کیا جا سکتا ہے۔ یہ کتاب شیر شاہ سوری کے زمانے تک ہی محدود ہے۔ اور سلاطین دہلی کے فنِ تعمیر پر محیط ہے۔ اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ لگا لینے کے لئے ہم دہلی اردو اکادمی کے سکریٹری زبیر رضوی صاحب کا بیان نقل کرتے ہیں۔ جس میں انہوں نے اس کی افادیت کو ان الفاظ میں تحریر کیا ہے:

> ''صہبا وحید نے تفصیل کے ساتھ سلاطین کے عہد کے مشترکہ فنِ تعمیر کے معلوم اور نامعلوم نمونوں کی نشان دہی کی ہے۔ اس نشان دہی میں مفروضوں سے زیادہ تاریخی اور تہذیبی اعتبار کو وزن دیا گیا ہے۔ تاکہ یہ کتاب ایک بے حد معتبر حوالہ ثابت ہو سکے۔ اور اس کے مندرجات کو کمزور یا قیاس اور شک کے خانوں میں نہ رکھا جا سکے۔''

(کتاب مذکور، جلد اوّل، ص 23)

۴۔ **عالم میں انتخاب، دلّی**: جیسا کہ نام سے ظاہر ہے کہ یہ کتاب دہلی کے تعلق سے ہی لکھی گئی ہے۔ اس کتاب کی وجہِ تخلیق ہم خود اس کے مصنف کے الفاظ میں تحریر کرتے ہیں۔ جو انہوں نے ''عرضِ احوال'' کے ضمن میں رقم کئے ہیں:

> ''دلّی کا ذکر ایک مفصل کتاب میں کرنے کی تمنا عرصے سے دل میں تھی۔ ۱۸۵۷ء کی دلّی کو ڈرامے کی صورت میں پیش کرنے اور شاہجہاں آباد کی تاریخی اہمیت کو ریڈیو، ٹیلی ویژن اور دیگر اخبارات اور رسائل میں اجاگر کرنے کی کوشش مسلسل طور پر کرتا رہا ہوں۔ لیکن زیرِ نظر کتاب میں دلّی کی سماجی زندگی اور اس کے تمدّن پر تفصیل سے روشنی ڈالنے کا حوصلہ کیا ہے۔''

(عالم میں انتخاب۔ دلّی، زیرِ عنوان ''عرضِ احوال'')

یہ کتاب دہلی کا مکمل تعارف کراتی ہے۔ اس کی صحیح صورت حال اور متفرق واقعات و حالات سے آگاہ کراتی ہے۔ اس کتاب میں کیا ہے؟ اور کس طرح اس کو دہلی کا آئینہ کہا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں ہم سیّد نور الحسن کی تحریر پیش کرتے ہیں۔ جس میں موصوف نے اس کتاب میں پیش کئے گئے مواد کا تعارف کرایا ہے۔ اس تعلق سے وہ اس طرح رقم طراز ہیں:

> ''لوگ کیسے مکانوں میں رہتے تھے۔ کیا ان کے شغل اور مشغلے تھے۔ پھیری والے کیا آوازیں لگاتے تھے۔ بچوں کے کھیل کود کیا تھے۔ کھانا، پینا، دسترخوان، پان اور حقہ اور ان سے متعلق کہاوتیں، دلّی کے لوک گیت، تہذیب اور وضع داری، داستان گوئی، تعلیمی ادارے، فنِ خطاطی، تشبیہیں اور استعارے، میلے اور تہوار غرض کہ ہر وہ

چیز جو طرزِ زندگی کی تصویر کھینچتی ہے۔مہیشور دیال صاحب نے پیش کی ہے۔''

(عالم میں انتخاب۔دلّی، زیرِ عنوان ''پیش لفظ'')

اس اقتباس سے قارئین بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس کتاب میں دی گئی معلومات سے دہلی کی تہذیب وثقافت کی پوری طرح آگاہی حاصل کی جاسکتی ہے۔

۵۔ **دلّی کے آثارِ قدیمہ**: اس کتاب کو فارسی تاریخوں کے تناظر میں لکھا گیا ہے۔جس کے مصنف معروف قلم کار ودانش ور خلیق انجم ہیں۔اس کتاب میں انہوں نے مفتاح التواریخ، خلاصۃ التواریخ، تاریخِ داؤدی، خزائن المفتاح، تاریخ مبارک شاہی، تاریخ شاہی، قانون ہمایوں، تاریخ فرشتہ، مآثر الامرا، تاریخ فیروز شاہی، سیر المتاخرین، طبقات اکبری، ظفرنامہ، عالم گیر نامہ، فتوحات فیروز شاہی، عجائب الاسفار اس کتاب (جو اصل میں فارسی کتابوں کا ترجمہ ہے) کو تصنیف کرانے میں دہلی اردو اکادمی کو جو مقصد رہا ہے وہ خود اس کے سکریٹری کے الفاظ میں ہی ملاحظہ فرمائیے:

''ہندوستان کے عہدِ وسطیٰ کی تاریخ کا سب سے بڑا مآخذ وہ فارسی تاریخیں ہیں۔جو اس عہد میں لکھی گئیں۔بدنصیبی ہے کہ ہمارے زمانے میں فارسی کا چلن بہت کم ہوگیا ہے۔اس لئے ہمارے مورخین اور عام لوگ فارسی تاریخوں سے استفادہ نہیں کر پاتے۔اردو اکادمی کی تحقیقی واشاعتی کمیٹی نے جب فیصلہ کیا کہ دہلی کی تہذیبی اور سماجی زندگی پر کتابیں تیار کرا کے شائع کی جائیں تو دلّی کے آثارِ قدیمہ میں خلیق انجم صاحب کی دلچسپی کے پیشِ نظر ان سے فرمائش کی گئی کہ وہ فارسی تاریخوں میں دلّی کے آثارِ قدیمہ کا جو ذکر آیا ہے۔اسے اردو میں ترجمہ کر کے کتابی صورت میں مرتّب کر دیں۔''

(دلّی کے آثارِ قدیمہ۔ص12)

یہ کتاب دراصل جن فارسی کتابوں کا اردو ترجمہ ہے وہ تمام دہلی کی تاریخ اور یہاں کے آثارِ قدیمہ سے متعلق ہیں۔یہ بھی دہلی شناسی کا ایک اہم حصہ ہے۔لہٰذا اس کتاب کا ذکر یہاں پر کر دیا گیا ہے۔اس میں اشاریہ اور تصویریں بھی دی گئی ہیں۔جن کی وجہ سے اس کی افادیت میں اور بھی اضافہ ہوگیا ہے اور یہ کتاب بھی دہلی شناسی کا ایک اہم مآخذ بن گئی ہے۔دہلی اردو اکادمی نے اس کو بھی اپنی اشاعتی اسکیم میں جگہ دے کر ہم اردو والوں پر احسان کیا ہے۔

۶۔ **سفرناموں میں دھلی**: اس کتاب پر ہمیں کچھ لکھنے سے پہلے ضروری محسوس کر رہا ہوں۔اسی کتاب سے ہی انیس اعظمی صاحب سکریٹری دہلی اردو اکادمی کی تحریر یہاں پر نقل کر دی جائے۔جس میں اس کتاب کی وجہِ تصنیف بیان کی گئی ہے:

''ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے سفرناموں اور اس کتاب کے حوالے سے کوئی مربوط تہذیبی تاریخ مرتب کی نہیں ہے۔بلکہ انہوں نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ عہدِ عتیق سے عہدِ ظفر تک سیاحوں نے جس رنگ میں، جس حالت میں، جس آن بان اور جمال و جلال کے عالم میں دلّی کو دیکھا وہ ہماری آنکھوں میں بھی عکس بن کر تیرنے لگے۔دلّی نے پچھلی چھ سات صدیوں میں کیا کیا انقلاب دیکھے، کس کروفر اور عروج وزوال کے شب وروز اس پر گزرے وہ کافی کچھ اس کتاب میں سمٹ آیا ہے۔''

(سفرناموں میں دہلی، زیرِ عنوان ''حرفِ آغاز''ص6)

اس کتاب میں جن سفرناموں کا ذکر کیا گیا ہے۔ان میں سفرنامہ ابن بطوطہ، مسالک الابصار، جہاں آباد (مغربی سیاحوں کی نظر میں) منوجی، نیوریز، بریز کا سفرنامہ، عہدِ محمد شاہی میں (شاہ جہاں آباد کی تہذیبی جھلکیاں) شاہجہاں آباد کی سیاحت، دل کا نگر۔دلّی، علم وعمل، سیر الحشتم، قلعۂ معلیٰ کی سیر (جان مارشل) شامل ہیں۔

یہ کتاب یوں تو سفرناموں پر مشتمل ہے۔مگر چونکہ یہ سفرنامے دہلی کے تعلق سے ہیں۔چنانچہ ان مسافروں نے دہلی کو جس طرح دیکھا۔دہلی میں جو کچھ دیکھا ان کا ذکر کیا ہے۔اس وجہ سے یہ کتاب بھی دہلی شناسی میں قابل ذکر کردار ادا کرتی ہے۔

۷۔ **اولیائے دھلی کی درگاھیں**: جیسا کہ نام سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کتاب دہلی کے اولیاء کرام کی درگاہوں کی البم ہے۔مگر چونکہ درگاہوں کے فوٹو (تصاویر) کے ساتھ ہی ان حضرات کا تذکرہ وتعارف بھی دیا گیا ہے۔اس وجہ سے یہ دہلی کی تاریخ کا حصہ بھی ہے۔اور ہر دو معنی میں دہلی شناسی کا مآخذ تسلیم کی جاسکتی ہے۔واقعی اس کتاب کو ترتیب وتصنیف کرنے میں ڈاکٹر محمد حفظ الرحمٰن نے بڑی محنت و جانفشانی سے کام لیا ہے۔یہ ہمارے دور کی ایک اہم علمی دستاویز کہی جاسکتی ہے۔جس کو قدماء کے تحقیقی وتاریخی کاموں کے ہم پلے قرار دیا جاسکتا ہے۔

اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ اکادمی کے سکریٹری کے اس اعتراف سے لگایا جاسکتا ہے:

''اکادمی کے چیئرمین کی دیرینہ خواہش تھی کہ اکادمی اس طرح کی کوئی کتاب شائع کرے۔جس میں دہلی کی درگاہوں اور خانقاہوں کی مستند تفصیل ہو۔تاکہ ریسرچ اسکالرز اور سیاحوں کو ان اہم مقامات کے بارے میں مفصل معلومات حاصل ہو سکے۔۔۔۔دہلی اردو اکادمی، دہلی کی تاریخ وثقافت سے موجودہ نسل کو روشناس کرانا اپنا بنیادی مقصد سمجھتی ہے۔اسی مقصد کے پیشِ نظر اس کتاب کو اہتمام کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔'' (کتاب مذکور، ص۱۱، زیرِ عنوان ''حرفِ آغاز'')

کتاب کے شروع میں فہرست اور آخر میں اشاریہ دئے گئے ہیں۔جن سے دہلی کے اولیائے کرام کے حالات تلاش کرنے میں بڑی آسانی ہوتی ہے۔غرض یہ کہ یہ کتاب بھی دہلی شناسی کا اہم مآخذ ہے۔جس کو شائع کر کے دہلی اردو اکادمی نے اردو دوستی کا ثبوت دیا ہے۔

دہلی اردو اکادمی کی جانب سے اگرچہ دہلی شناسی کے تعلق سے اور بھی کتابیں شائع کی گئی ہیں لیکن اس مختصر سی تحریر میں زیادہ کچھ نہیں پیش کیا جاسکتا۔چنانچہ اس پر اختتام کر رہا ہوں۔تاہم یہ ضرور باور کرانا چاہتا ہوں کہ میں نے زیرِ نظر مقالے میں جن کتابوں کو شامل کیا ہے۔وہ اردو اکادمی، دہلی کی وہ اشاعتی خدمات ہیں۔جن کے ذریعے ہم دہلی کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ان میں سے کچھ کتابوں سے دہلی کی تہذیب وثقافت کا اندازہ ہوتا ہے۔کچھ میں عمارات وعلاقات کا ذکر کیا گیا ہے۔کچھ کتابوں سے دہلی کے تمدّن کو سمجھا جاسکتا ہے تو کچھ کتابیں یہاں کے اعلام و اشخاص اور اولیاء وبزرگان سے متعارف کراتی ہیں۔غرض یہ کہ ہر ایک کتاب ہی دہلی شناسی میں اپنا کچھ نہ کچھ رول ادا کرتی ہے۔

مآخذات

☆ آثار الصنادید، سرسیّد احمد خاں

☆ واقعات دارالحکومت دہلی، مولوی بشیر الدین احمد

☆ اولیائے دہلی کی درگاہیں، ڈاکٹر محمد حفظ الرحمٰن

☆ ہندی۔اسلامی فن تعمیر، صہبا وحید

☆ دہلی کے آثارِ قدیمہ، خلیق انجم

☆ سفرناموں میں دہلی، ڈاکٹر تنویر احمد علوی

☆ چراغِ دہلی، میرزا حیرت دہلوی

☆ دہلی کی آخری شمع، مرزا فرحت اللہ بیگ

☆ عالم میں انتخاب۔دہلی، مہیشور دیال

(جملہ کتابوں کی اشاعت دہلی اردو اکادمی نے کی ہے۔)

☆☆☆

غلام مصطفیٰ اشرفی



اردو اور گوجری زبان کا لسانی اشتراک: ایک جائزہ

زبان کیا ہے، زبان کی کیا خصوصیات ہیں اور کس طرح ایک زبان ادب کی تخلیق کرتی ہے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کے جوابات دینے کے لیے ایک استاد، شاعر ،ادیب، نقاد اور محقق سے پہلے ادب کا ایک معمولی طالب علم بننا بہت ضروری ہے۔اس دنیا میں بے شمار اشیا ہیں جن پر ہم نے کبھی غور نہیں کیا، ان میں ایک ''زبان'' بھی ہے۔اس زبان کی اہمیت وہی جانتا ہے جس کے پاس زبان نہیں ہے۔ایک ہوتی ہے کمیونی کیشن اور دوسری ہوتی ہے زبان، کمیونی کیشن زبان نہیں ہے، کمیونیکیٹ کوئی بھی چیز ہوسکتی ہے، جیسے ایک چراغ روشنی کمیونیکیٹ کرتا ہے مگر ہم اس کو زبان نہیں کہتے۔اسلامی عقائد کے مطابق قدرت نے انسان کی پیدائش کے بعد اسے سب سے پہلے زبان عطا کی (**خلق الانسان علمه البیان**)۔کچھ دانشوروں کا یہ بھی کہنا ہے کہ انسان کی تخلیق سے پہلے لفظ کی تخلیق ہوئی مثلاً اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کی تخلیق سے قبل فرشتوں سے جو کلام کیا وہ بھی ایک زبان سے ہی کیا ہوگا، اسی کے پیش نظر زبان کے مختلف نظریات سامنے آتے ہیں جیسے: (۱) کنٹی نیوٹی تھیوری جس میں: بوہ وہوتھیوری، پوہ پوہ تھیوری، یوہی ہوتھیوری، اورل گیسچر تھیوری وغیرہ (۲) ڈس کنٹی نیوٹی تھیوری، جس میں ڈارون کا نظریۂ ارتقا بھی اہم ہے کہ انسان نے آہستہ آہستہ بولنا شروع کیا۔اگر کمیونی کیشن کو ایک وسیع اصطلاح مان لیا جائے تو زبان اس کا سب سے بڑا حصہ ہوگی۔زبان کا ماخذ عربی زبان میں (لسان) ہے، اسی سے لسانیات وجود میں آیا۔لیکن لسانیات اور زبان میں فرق یہ ہے کہ لسانیات میں زبان کا مطالعہ سائنسی طریقے سے ہوتا ہے جس کو تجربات ومشاہدات سے ثابت کیا جاتا ہے۔اس کو ہم ذہنی مطالعہ بھی کہہ سکتے ہیں کیوں کہ جب ایک انسان آپ سے مخاطب ہوتا ہے تو وہ حقیقت میں آپ سے نہیں بلکہ آپ کے ذہن سے مخاطب ہوتا ہے۔ایک انسان اسی زبان کی وجہ سے حیوان پر فضیلت رکھتا ہے۔

زبان کی ایک تعریف یہ ھے :

''زبان بالقصد، من مانی، قابل تجزیہ، صوتی علامات کا وہ نظام ہے، جس کے ذریعے سے ایک انسانی گروہ کے افراد اپنے خیالات وجذبات کی ترسیل باہمی کرتے ہیں۔''

"language is a system of voluntarily produced arbitrary, analysble,vocal symbols trough whicha community communicates its thoughts and feelings."

گوجری زبان اور گجر قوم کا تعارف :

☆ ریختہ کی ڈکشنری کے اعتبار سے ''گوجری'' لفظ انگریزی میں (gujrii) ہے اور اس کا معنیٰ گوجر ذات، گجرات کے علاقے کی زبان، گوری عورت، ایک راگنی وغیرہ ہے۔یہ زبان بین الاقوامی سطح پر بولی جاتی ہے جو بھارت، پاکستان اور افغانستان میں زیادہ بولی جاتی ہے اور اٹلی، چین اور فرانس میں کم۔بھارت کی بات کریں تو یہاں گوجری زبان گجرات، راجستھان، جموں وکشمیر، لداخ، ہماچل پردیش، اتراکھنڈ، پنجاب اور ہریانہ میں بڑے پیمانے پر بولی جاتی ہے۔پاکستان میں یہ زبان آزاد کشمیر، گجرحان، گجراں والا اور ہزارہ وسوات کے تمام علاقوں میں بولی جاتی ہے۔ہندوستان میں جموں وکشمیر کو ایک خصوصیت حاصل ہے کہ یہاں گوجری زبان کو آئین ریاست کی 6 فہرست بند زبانوں میں شامل کیا گیا تھا۔

☆ گوجری زبان کے خاندان کی بات کریں تو یہ ہند آریائی زبانوں میں سے ہے۔جیسا کہ اہل تاریخ جانتے ہیں کہ سنسکرت زبان کے سخت لسانی قوانین یعنی سنسکرت کا برہمنوں تک ہی محدود ہونے سے عوامی بولیاں رفتہ رفتہ الگ ہوگئی تھیں جن کو پراکرت کہا جاتا ہے ،جن کا دور 500 ق م سے لے کر 700 کے لگ بھگ ہے۔یہ پراکرت اپنے آخری دور میں اپ بھرنشوں کے نام سے جانی جاتی ہیں اور پورے برصغیر میں اپنے اپنے علاقوں کے اعتبار سے تقسیم ہوجاتی ہیں۔700 سے لے کر 1000 تک کے دور میں یہ اپ بھرنش زبانیں اپنے علاقے کے نام سے موسوم ہوجاتی ہیں۔ہندوستان کی بقیہ ریاستوں کی طرح گجرات میں بھی راجاؤں کی حکومت تھی جو کہ گجر حکمران تھے، جس کی وجہ سے وہاں کی اپ بھرنش زبان گوجری کہلائی۔تاریخ میں اس کے مختلف نام ہیں جیسے کہ 'گجر'، 'گوجر'، 'گرجار'، 'گجری'، 'گوجری' وغیرہ، عرب قوم نے اسے **''الجزر''** لکھا ہے۔گوجری زبان کو ہم کسی علاقے یا اس کی جغرافیائی حیثیت کے ساتھ خاص نہیں کر سکتے کیوں کہ علاقائی زبان اس کو کہتے ہیں جو کسی ایک علاقے سے منسوب ہو یا ایسے چند علاقے جو کہیں نہ کہیں آپس میں جغرافیائی حدود کے اعتبار سے جڑے ہوں، جیسے پنجابی زبان پنجاب کے علاقے یا اس سے متصل خطوں کی زبان ہے، اسی طرح کشمیری زبان کشمیر میں، سندھی زبان سندھ میں اور اس کے علاوہ سیکڑوں زبانیں ہیں جو اپنے علاقے سے منسوب ہیں، لیکن گوجری زبان کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ وہ کسی علاقے سے نہیں بلکہ ایک پوری قوم کی نمائندگی کرتی ہے جو صرف ہندوستان میں ہی نہیں بلکہ بین الاقوامی سطح پر بھی بولی جاتی ہے۔الغرض جہاں جہاں گجر قوم آباد ہے وہاں یہ زبان رائج ہے مثلاً سوات کا علاقہ اور پونچھ کا علاقہ جغرافیائی اعتبار سے ہزاروں میل کی مسافت ہے اسی طرح افغانستان اور راجستھان میں کتنا جغرافیائی فاصلہ ہے۔اگر گوجری زبان ایک علاقائی زبان ہوتی تو اتنے دور دراز علاقوں میں بغیر جغرافیائی اتصال کے اپنے اصل ثقافتی رنگ اور لسانی مزاج سے نہ بولی جاتی، جو اس بات کی دلیل ہے کہ یہ زبان اپنا

ریسرچ اسکالر، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی۔110025
فون:9149977425 ghulammustfa3805@gmail.com

ایک الگ تھلگ ثقافتی وتہذیبی معیار رکھتی ہے۔

دسویں صدی عیسوی سے لے کر مغل دور حکومت تک یہ زبان گجرات کی سرکاری زبان کا درجہ رکھتی تھی۔ جس کو اس وقت کے قلمکاروں نے پروان چڑھایا تھا جن میں صوفیاء واد باء کا اہم رول ہے۔ صوفیائے کرام نے اسی گوجری زبان میں اپنے پیغام کو عوام تک پہنچایا۔ اس دور کے اہم ادباء اور شعراء میں سید نور دین محمد عرف ست گرو، شیخ عبدالقدوس گنگوہی، شاہ برہان الدین جانم، شیخ محمد امین، خوب محمد چشتی ومظفر خان وغیرہ شامل ہیں۔ گوجری زبان کے اسی عروج کے ساتھ اس کا زوال بھی ہونا شروع ہوا، جب اکبر نے گجرات پر 1572 میں حملہ کیا۔ تاریخی ستم ظریفی کی وجہ سے گجر قوم برصغیر کے مختلف حصوں میں جا کر پناہ گزیں ہونا شروع ہوئی۔

گجرات کی یہ گجر قوم ہندوستان کے دیگر علاقوں میں آ تو گئی لیکن ان کو زبان کے حوالے سے ایک بڑا نقصان اٹھانا پڑا اور وہ یہ کہ ان کی یہ زبان جو کہ ایک ریاست کی سرکاری زبان کا درجہ رکھتی تھی مگر سقوط گجرات سے لے کر بیسوی صدی کے آغاز تک تحریر سے محروم ہوگئی، اس دور میں لسانی خلا کا تصور تو نہیں کیا جا سکتا، کیوں اس زبان کا لوک ادب سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا رہا مگر یہ زبان اس دور میں قلم وقرطاس سے ضرور محروم رہی۔ ان حالات میں وہ لوگ جو اپنی زبان وثقافت پر کوئی سمجھوتہ نہ کر سکے وہ اس کو بچانے کے لیے بلند پہاڑوں پر چلے گئے۔ ان پہاڑوں میں جانے کے بعد ان گوجروں میں بھی قبائلی تقسیم شروع ہوگئی۔ ان میں زمیندار لوگوں کو ''بسنیک گجر''، گائے بھینس رکھنے ولے اور ان کا دودھ بیچنے والے کو 'نبیہارے' یا 'دودھی گجر' اور بکریاں چرانے اور ان کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے والے خانہ بدوش لوگوں کو 'بکروال گجر' کہا جانے لگا۔ معاشی اور جغرافیائی اعتبار سے یہ تینوں فرقے اگر چہ الگ الگ نظر آتے ہیں، لیکن زبان کے حوالے سے ان کو الگ نہیں کیا جا سکتا۔ ان میں جو زمیندار طبقہ ہے وہ معاشی اعتبار سے زیادہ مضبوط ہے بہ نسبت دوسرے طبقوں کے۔

تقسیم ہند کے بعد گوجری زبان کا جدید دور شروع ہوتا ہے۔ اس دور کو گوجری زبان کا جدید دور اس لیے کہا جاتا ہے، کیوں کہ اس دور میں یہ زبان سینہ بہ سینہ منتقل ہونے کے ساتھ ساتھ صفحۂ قرطاس پر آ جاتی ہے۔ اس دور جدید میں اس زبان کا ادبی فروغ بھی اس کے پھیلنے میں کافی حد تک سنہرا رول ادا کرتا دکھائی دیتا ہے۔ آج اس زبان کی اصناف ادب میں داستان، کہانیاں، افسانے، غزلیں، بیت، مذہبی شاعری، جس میں نعت ومنقبت شامل ہیں جو اس زبان کو ارتقا کی بلندیوں تک لے جاتی ہیں۔

مذکورہ بالا نکات کی روشنی میں میں یہاں کچھ باتوں کو بیان کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ آج گوجری زبان اگر چہ ایک علاقائی مکمل لینگو افرینکا نہیں ہے لیکن اس کے باوجود اس زبان کی پہچان ایک مکمل قوم اور قبیلے سے ہے جو کہ اس کا امتیاز ہے۔ دوسری یہ بات کہ اس زبان کو سمجھنے کے لیے گجر ذات کو اور اس کی تاریخی حیثیت کو سمجھنا ضروری ہے۔ تیسری یہ کہ آج کے پڑھے لکھے طبقے سے تعلق رکھنے والے لوگ اس زبان کو صرف ان لوگوں کی زبان مانتے ہیں جو کہ بکروال طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں اور یہ بات کافی حد تک صحیح بھی ہے کہ بکروال طبقہ نے گوجری زبان کی جس قدر حفاظت کی ہے دوسرے دونوں طبقے نہیں کر سکے۔ ناخواندگی کی وجہ سے خالص گوجری زبان کے الفاظ اور ان کی ادائیگی اگر چہ آج بھی اسی طبقہ کی خاصیت ہے اور آج اگر ہمیں اس زبان کے بنیادی الفاظ اور ان کی ادائیگی کے حوالے سے تحقیق کرنی ہے تو ہمیں اسی طبقہ کی طرف رجوع کرنا ہوگا، مگر اس زبان کی تکمیل میں ہم دوسرے طبقات کو بھی فراموش نہیں کر سکتے۔ اگر بکروال طبقہ نے اس زبان کو سنبھالنے کا کام کیا ہے تو دوسرے دونوں طبقوں کے افراد نے اسے بین الاقوامی سطح تک پہنچانے کا کام کیا ہے جو کہ اس زبان کے فروغ میں ناقابل فراموش عمل ہے۔

گوجری ادب کا آغاز وارتقا:

جیسا کہ یہ بات ظاہر ہے کہ گوجری زبان برصغیر کی قدیم زبانوں میں سے ایک ہے پانچویں صدی عیسوی سے لے کر تیرہویں صدی عیسوی تک یہ زبان چوں کہ گجرات میں سرکاری زبان کی حیثیت رکھتی تھی۔ سرکاری سرپرستی کے دور میں ادیبوں اور شاعروں نے کافی مقدار میں گوجری ادب تخلیق کیا البتہ اگر اصناف ادب کی بات کی جائے تو اس زبان میں نثر کے مقابلے شعری ادب بہت زیادہ ہے اور وہ شعری کلام بھی اکثر صوفیانہ طرز کا کلام ہے۔ اس دور کے اہم ادباء اور شعراء میں سید نور دین محمد عرف ست گرو، شیخ عبدالقدوس گنگوہی، شاہ برہان الدین جانم، شیخ محمد امین، خوب محمد چشتی ومظفر خان وغیرہ شامل ہیں۔

پندرہویں صدی عیسوی کے بعد چوں کہ گوجری حکومتوں کا زوال شروع ہوگیا، ساتھ ہی سرکاری سرپرستی بھی ختم ہوگئی اور اس زبان پر فارسی وعربی کے ڈھانچے تعمیر ہونا شروع ہوگئے اور آہستہ آہستہ اسی زبان سے اردو کا ڈھانچہ بھی تیار ہوتا ہے، لیکن اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ گوجری زبان اپنے وجود کو ختم کر دیتی ہے بلکہ اس زبان نے گجر قوم کا ساتھ نہ چھوڑا اور نہ ہی گجر قوم نے اس زبان کا۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہیں ہوگا کہ جس طرح اس زبان سے پیدا ہوئی اردو زبان درباروں میں پلتی ہے اسی طرح گوجری زبان کوہساروں اور پہاڑوں میں پلتی ہے یہ الگ بات ہے کہ بیسویں صدی تک یہ زبان صفحۂ قرطاس سے محروم ہوجاتی ہے مگر لوگوں کے سینوں میں محفوظ رہتی ہے۔

گوجری زبان اردو کا ماخذ ھے:

اردو زبان کی تاریخ سے ظاہر ہے کہ ہند آریائی زبانیں جب اپ بھرنش میں تبدیل ہو گئیں اور علاقائی طور پر تقسیم ہوگئیں تو گجرات میں گوجری زبان اپنے عروج پر تھی، ساتھ ہی اس زبان میں کافی صوفیانہ ادب بھی تخلیق ہو چکا تھا۔ لیکن جیسا کہ تاریخ سے ثابت ہے کہ اس گوجری زبان کا زوال شروع ہوا تو اس کے بولنے والے مختلف جگہوں، جنگلوں اور بیابانوں میں چلے جاتے ہیں۔ مغلیہ دور میں اس گوجری زبان پر فارسی کے مکمل اثرات پڑنے شروع ہوئے۔ فارسی وعربی زبان اور گجراتی زبان کے اس ملاپ کی وجہ سے گوجری زبان کے تحریری اور درباری لہجے اور مزاج میں ایک نیا رنگ آ جاتا ہے۔ اب یہاں گوجری زبان اور گجرات کی اس ملی جلی زبان میں کافی فرق واضح ہونے لگا۔ گجرات میں مغلیہ کلچر کے زیر اثر لکھی جانے والی زبان میں فارسی وعربی کا لسانی مزاج ضم ہو کر ایک مختلف زبان وجود میں آنا شروع ہوگئی۔ اسی انوکھی زبان نے دھل نکھر کر آنے والے دور میں اپنا نام 'کھڑی' یا 'اکھڑی' کہلایا۔ اس حوالے سے ڈاکٹر جمیل جالبی نے بھی اپنی کتاب 'تاریخ ادب اردو' میں تحریر کیا ہے کہ جب دکن میں اردو کے نئے مراکز ابھرے تو وہاں کے اہل علم وادب نے قدرتی طور پر گوجری ادب کی روایت کو اپنایا۔ اسی کتاب سے یہ اقتباس ملاحظہ کریں:

> ''گجری ادب کی یہ خالص ہندوی روایت اس عرصے میں دھل منجھ کر اتنی صاف اور مقبول ہوجاتی ہے کہ بعد کی نسلیں بھی اپنے متصوفانہ خیالات کے اظہار کے لیے اسی روایت کی مخصوص ہیئت کو پسند کرتی ہیں۔ ''مرشد نامہ'' میں شیخ عبدالقدوس گنگوہی (902ھ/1496) اسی صنف کو استعمال کرتے ہیں۔ ''گرو گرنتھ صاحب'' میں یہی ہیئت نظر آتی ہے۔ دکن میں میراں جی شمس العشاق (902ھ/1496) ابراہیم عادل شاہ جگت گرو (1036ھ/1626) برہان الدین جانم (990/1582) وغیرہ بھی اسی صنف سخن کو اپنا ذریعۂ اظہار بناتے ہیں، یہاں تک کہ اٹھارہویں صدی عیسوی میں شاہ عبداللطیف

بھٹائی بھی اپنے صوفیانہ خیالات کے لیے اس ہیئت کو اپنے تصرف میں لاتے ہیں۔اسی ہیئت کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے اوزان ہندوی ہیں اور مختلف راگ راگنیوں کے مطابق اشعار لکھے گئے ہیں۔''

یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ ہمیں گوجری زبان اس کے نام کی وجہ سے گجرات سے منسلک نظر آتی ہے،لیکن ایسا بالکل نہیں ہے کیوں کہ گوجری زبان گجرات کی زبان نہیں ہے بلکہ یہ ایک قوم کی زبان ہے،جب یہ قوم دکن میں تھی تو گوجری زبان موجود تھی اور جب یہ قوم گجرات میں اپنا اقتدار قائم کرتی ہے تو وہاں یہ قوم اپنی زبان میں ترقی کرتی ہے۔اسی طرح جب اس زبان کے بولنے والے گجرات سے نکل کر مختلف ریاستوں کا رخ کرتے ہیں تو وہاں پہنچ کر اپنی زبان کی ترویج وترقی کرتے نظر آتے ہیں۔ان سب باتوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ ایک قوم کی زبان ہے جسے وقتاً فوقتاً دوسری اقوام نے بھی اپنایا ہے اور بلاتفریق نسل وقبیلہ تمام اہل ادب نے اس زبان میں بیش بہا ادب تخلیق کیا ہے،اس کی زندہ مثال آج کے پاکستان میں ہزارہ، سوات، مظفرآباد، تراکھل، راولاکوٹ، باغ اور دیگر ایسے بہت علاقے ہیں جہاں دیگر قبائل کے لوگ بھی گوجری زبان کو اپنی تحریر وتقریر کا ذریعہ بنائے ہوئے ہیں۔ساتھ ہی ایسے لوگ جو بنیادی طور پر گوجر نہیں ہیں مگر اس کے باوجود ریڈیو اور ٹی وی کے گوجری پروگراموں سے بھی منسلک ہیں۔

جیسا کہ اس بات کا ذکر ہو چکا ہے کہ مغلوں کے دور حکومت میں اکبر کے حملے کی وجہ سے گوجری زبان کی جگہ فارسی زبان سرکاری زبان بن گئی اور گوجری زبان کے اندر فارسی وعربی زبان کی آمیزش ہونے کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں ایک منفرد ملی جلی زبان عوام کے درمیان ربط وتعلق قائم کرنے کا کام کرنے لگی۔درحقیقت اکبر بھی ایک ایسی زبان کی تشکیل کا خواہاں تھا جو فارسی وعربی اور گوجری زبان بولنے والوں کے درمیان ایک پل کا کام کرے اور اسی لیے اس نے ایک تیسرے کلچر مغل کلچر کی بنیاد ڈالی۔یہ وہ دور تھا جب کہ گوجری زبان اقتدار کے ایوانوں سے نکل گئی اور اس کی سرپرستی کرنے والا کوئی نہ رہا،اسی وجہ سے گوجری ادیبوں کی قدر ومنزلت بھی ختم ہونے لگی۔تاریخ کے حوالے سے یہی وہ دور ہے جب گوجری میں عربی وفارسی اور ترکی کی آمیزش کا سلسلہ شروع ہوا اور انہی چاروں زبانوں کے ملنے سے ایک نئی زبان کا خمیر تیار ہوتا ہے جس کو آنے والے دور میں اردو کے نام سے جانا جاتا ہے۔تاریخی حوالے سے اگر بات کی جائے تو حقیقت میں اکبر کے دور سے قبل باضابطہ اردو زبان کا وجود ہمیں نظر نہیں آتا ہے۔اسی وجہ سے اگر یہ کہا جائے کہ اردو زبان نے گوجری کی کوکھ سے جنم لیا اور اردو کی ماں گوجری زبان ہے تو بے جا نہ ہوگا کیوں کہ گوجری زبان نے ہی اس سلجھی ہوئی اردو زبان کا خمیر تیار کیا تھا۔

گوجری زبان کی ایک امتیازی حیثیت یہ رہی کہ اس زبان میں دیگر زبانوں کی ملاوٹ ہونے کے بعد جب اس کا وجود ختم ہونے لگا تو اس کے بچانے والے پہاڑوں، ریگستانوں اور ساحلی علاقوں میں چلے جاتے ہیں اور اپنی گوجری زبان کو مرنے نہیں دیتے بلکہ جہاں جہاں یہ گوجر لوگ قیام پذیر ہوئے وہاں انہوں نے اپنی زبان کے فروغ کے لیے بے شمار کارنامے انجام دیے۔اردو کی یہ ماں پہاڑوں میں رہنے لگی اور اس کے بالمقابل گوجری زبان کی یہ بیٹی اردو زبان درباروں کی زینت بننے لگی اور عوام وخواص کی محبوب زبان کا درجہ حاصل کر لیا۔'' گوجری زبان سے ہی اردو زبان کا خمیر تیار ہوا'' اس کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ تاریخی حقائق کے حوالے سے اس دور میں پورے برصغیر ہند میں گجرات ہی اردو زبان کا پہلا واحد مرکز تھا اور جس وقت دکن میں چھوٹے چھوٹے اردو کے مراکز قائم ہونے لگے تو وہاں اہل ادب نے قدرتی طور پر گوجری ادب کو پہلے اپنایا، چوں کہ جب بھی کوئی نیا کام شروع کیا جاتا ہے تو انسان یہ جاننے کی کوشش کرتا ہے کہ اس سے تجربہ حاصل کیا جائے جو اس سے قبل یہ کام کر چکا ہو اور دکن کے ادیبوں نے گوجری زبان کو پہلے اپنایا اس کا ثبوت شاہ برہان الدین جانم کی تصانیف سے ظاہر ہے کہ انہوں نے اپنی کتاب میں کئی جگہ اپنی زبان کو گجری کے نام سے پکارا ہے۔اس حوالے سے احمد الدین عنبر لکھتے ہیں:

''موجودہ اردو زبان گوجری کی جدید قسم ہے، کیوں کہ عربی، فارسی کے الفاظ کی آمیزش سے جو زبان بنی اس نے لشکری یا اردو کا نام پایا، ہندوستان کی تمام زبانیں جن میں تیلگو، مالباری، مرہٹی، مدراسی، سندھی، ہندی اور پنجابی وغیرہ شامل ہیں یہ گوجری سے بعد کی پیداوار ہیں۔''

کچھ آہنی خیالات کی عکاسی کرتے ہوئے گوجری زبان کے ایک مشہور شاعر اسرائیل مہجور نے اپنی گوجری شاعری میں چند اشعار لکھے ہیں:

لگے مٹھا کی تھوڑ ناں کدی اس ناں — جس کی زمیں ماں ہووے کماد پیدا
شاہا کہیے اجھیا درخت ناں توں — جس کا پھل ماں ہووے سواد پیدا
چنگی ہووے نہ جد تک ماں کوئی — پتر ہووے نہ نیک نہاد پیدا
مٹھی گوجری جھئی زبان کیڑھی — ارد اس کی ہوئی الاد پیدا

گوجری اور اردو کا لسانی اشتراک :

جس طرح کہ گزشتہ باتوں سے یہ بالکل ظاہر ہو چکا ہے کہ پورے برصغیر میں اردو زبان کے اگر کوئی سب سے قریب زبان ہے تو گوجری ہے کیوں کہ اسی گوجری زبان سے اردو کا خمیر تیار ہوا تھا۔یہ زبان مختلف ادوار میں ترقی کرتے ہوئے مختلف علاقہ جات جن میں ہماچل پردیش، جموں وکشمیر کے تمام خطے، ہزارہ، گجراں والا اور افغانستان کے مختلف علاقوں میں پھیلتی چلی گئی اور اپنا ایک لسانی وادبی منفرد مقام بنانے میں کامیاب رہی۔یہ الگ بات ہے کہ بیسویں صدی تک اس زبان نے تحریری طور پر ترقی نہیں کی اور اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ اردو والوں نے اس زبان کی اہمیت کو اتنا بڑھاوا نہیں دیا اور نہ ہی اس زبان کی اردو ادب کی تاریخ میں وہ حیثیت برقرار ہو سکی جس کی یہ حقدار تھی۔

جہاں تک گوجری اور اردو زبان کے لسانی رشتے کی بات ہے تو، جب گوجری زبان کے جاننے والے مختلف علاقوں اور پہاڑوں میں جا کر بسنے لگے تو ان کی زبان آپس میں بات چیت کرنے سے نکھرنے لگی اور بیسویں صدی تک آتے آتے وہ ایک مکمل زبان کی شکل بنانے میں کامیاب رہی۔جیسا کہ یہ بھی ظاہر ہے کہ بیسویں صدی سے قبل تک یہ زبان صرف لوک ادب کی طرح سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی رہی اور صفحۂ قرطاس پر آنے کا موقع فراہم نہ کر سکی۔اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اس زبان کے جاننے والے چوں کہ پہاڑوں میں رہنے کی وجہ سے ناخواندگی اور پسماندگی میں گھر جاتے ہیں جس سے ان کی یہ زبان صرف اپنے علاقے تک محدود رہ جاتی ہے اور اردو کی طرح ترقی نہیں کر پاتی ہے۔لیکن تاریخ گواہ ہے کہ جیسے ہی اس زبان کو تحریری طور پر پھلنے، پھولنے کا موقع میسر آیا تو اس زبان نے اس تیز رفتاری سے ترقی کرنا شروع کیا کہ تقسیم ہند سے لے کر آج 75 برسوں میں اس زبان کے اندر اتنی وسعت آ گئی ہے کہ دنیا کے تمام تہذیبی وادبی مضامین اور تمام شعری ونثری اصناف اس زبان میں موجود ہیں۔آج گوجری اور اردو کو جب ہم لسانی اصولوں اور الفاظ کی بناوٹ کے حوالے سے دیکھتے ہیں تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ اردو اور گوجری زبان آپس میں ماں اور بیٹی کا نہیں بلکہ دو بہنوں کے جیسا رشتہ رکھتی ہیں۔یہاں میں چودھری عطاء الرحمٰن جو کہ گوجری نثر ونظم کے ایک اہم ادیب ہیں ان کے مضمون کا ایک حوالہ دینا ضروری سمجھتا ہوں۔اس اقتباس سے آپ کو اس زبان کی اردو زبان کے ساتھ مماثلت کا اندازہ ہو جائے گا۔وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:(گوجری اقتباس)

''فی زمانہ لوکاں کو کتاب داروں جی بھر گیو ہے۔ پڑھیا لکھیا لوک وی کتاب نا ں سرسری نظراں نال دیکھ کے پراں سٹ چھوڑیں۔ اس طرز عمل تیئں کئی پڑھن جوگی کتاب بغیر پڑھیاں رہ جائیں۔ افراتفری کا اس دور ماں صرف وئی کتاب پڑھی جائے جیڑی اپنا قاری ناں زور آوری نال اپنا دار چھک لئے''۔

(اس اقتباس کا اردو ترجمہ)

''اس زمانے میں لوگوں کا کتاب سے دل بھر چکا ہے۔ پڑھے لکھے لوگ بھی کتاب کو ایک سرسری نگاہ سے دیکھ کر اس کو بند کر دیتے ہیں۔ اس طرز عمل کی وجہ سے بہت ساری پڑھی جانے والی کتابیں بغیر پڑھے رہ جاتی ہیں۔ اس افراتفری کے دور میں صرف وہی کتاب پڑھی جاتی ہے جو کہ قاری کو اپنی طرف راغب کرتی نظر آتی ہے''۔

مذکورہ اقتباس کو سننے کے بعد آپ خود اس کے الفاظ میں غور کریں جیسے :لوگ کی جگہ لوکاں، گیا ہے کی جگہ گیو ہے، میں کی جگہ ماں وغیرہ اردو سے کس قدر مماثلت رکھتے ہیں۔ اس حوالے سے ڈاکٹر صابر آفاقی لکھتے ہیں:

''گوجری اور اردو میں صوتی، حرفی نحوی مماثلت کے علاوہ ذخیرۂ الفاظ، روز مرہ محاورہ اور ضرب الامثال ایک جیسی ہیں۔ یہاں تک کہ اصناف نظم ونثر اور شاعری کی بحور اور اوزان، دونوں زبانوں میں ایک جیسے ہیں۔''

اسی طرح گوجری ضمائر کی بات کریں وہ بھی اردو ضمائر سے بہت حد تک مشترک نظر آتے ہیں۔ ضمیروں کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں جیسے:

اردو	گوجری	اردو	گوجری
وہ	اوہ، وے	یہ	یا
ہمارا	ہمارو	تمہارا	تھارو
تیرا	تیرو	میرا	میرو

مذکورہ تمام ضمائر کو دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اردو زبان اور گوجری زبان کے مختلف ضمائر آپس میں کافی حد تک یکساں نظر آتے ہیں۔ اسی طرح اگر اردو زبان اور گوجری زبان کے مشترکہ الفاظ کی بات کریں تو وہاں بھی ہمیں کچھ ایسا ہی دیکھنے کو ملتا ہے:

اردو	گوجری	اردو	گوجری
پانی	پانیں	تحریر	تحریر
داڑھی	داڑھی	پیدا	پیدا
چہرہ	چہرو	آنکھ	اکھ
ہاتھ	ہتھ	پیر	پیر
کھاٹ	کھٹ	کپڑا	کپڑو
کھوٹا	کھٹو	پردہ	پردو
حقا	حقو	چمچا	چمچو

اس طرح کے بے شمار الفاظ ہیں جو اردو اور گوجری میں مشترک ہیں۔ جہاں تک گوجری زبان کے مصادر سے دیگر الفاظ بنانے کے اصول کی بات ہے تو زیادہ ایسے الفاظ ہیں جہاں اردو کے الفاظ کے آخر میں الف آتا ہے تو جب اس کو گوجری زبان میں بدلنا ہو تو 'الف' کو حذف کر کے 'ن' اور 'واؤ' کا اضافہ کریں گے جیسے 'نہانا' سے 'نہانو'۔ کاٹنا سے کاٹنو، کھانا سے کھانو، ناچنا سے ناچنو، کرنا سے کرنو۔ اس طرح تقریباً تمام مصادر میں یہی اصول وضع کیا گیا ہے۔

اسی طرح ہم اگر گنتی کی بات کریں، محاورات کی بات کریں، ضرب الامثال کی بات کریں تو تقریباً ہر جگہ اردو زبان کے الفاظ اور گوجری زبان کے الفاظ میں اشتراک نظر آئے گا۔ اگر واحد جمع کی بات کریں تو جیسے اردو میں واحد کے آخر میں الف ہے تو اس کو یائے مجہول سے بدل دیتے ہیں جیسے: گھوڑا سے گھوڑے۔ گوجری زبان میں چونکہ واحد کے آخر میں واو ہوتی ہے تو اس کو الف سے بدل کر جمع بنا دیتے ہیں جیسے: گھوڑو سے گھواڑا، کوٹھو سے کوٹھا، کمرو سے کمرا وغیرہ۔ اسی طرح اگر واحد مؤنث کے آخر میں ی ہو تو اسے گوجری میں یں سے بدلتے ہیں جیسے: بلی سے بلیں، چنگی سے چنگیں، کاپی سے کاپیں، گدری سے گدریں وغیرہ۔

مندرجہ بالا قواعد صرف ونحو، واحد جمع، مؤنث ومذکر، ضمائر وغیرہ کے جائزے کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ دونوں زبانیں بہت زیادہ ایک دوسرے کے قریب ہیں ساتھ ہی بہت سارے قواعد بھی آپس میں اشتراک رکھتے ہیں۔

جموں و کشمیر میں گوجری زبان :

مرکز کے زیر انتظام جموں وکشمیر اور لداخ میں مختلف نسلوں اور قبیلوں کے لوگ آباد ہیں ۔2011 کی مردم شماری کے مطابق کل آبادی ایک کروڑ پچیس لاکھ، اکتالیس ہزار تین سو دو ہے۔ جس میں گجر بکروال کی آبادی 12 فی صد یعنی 15 لاکھ ہے۔ ان قبائل میں سب سے بڑی آبادی گجر بکروال کی آبادی ہے۔ موجودہ دور میں (ایک رپورٹ کے مطابق) جموں وکشمیر کی شرح خواندگی 71 فی صد ہے اور اس میں گجر قوم کی شرح خواندگی 32 فی صد ہے اور بکروال کی 23 فی صد ہے۔

اگر ریاست جموں وکشمیر میں زبانوں کی بات کریں تو اس وقت جموں وکشمیر میں چار بڑی زبانیں رائج ہیں: کشمیری، ڈوگری، گوجری، پہاڑی۔ اس وقت ریاست میں گوجری زبان بولنے والے تیسرے نمبر پر ہیں۔ جموں وکشمیر کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ یہاں گوجری زبان کو جو رسم الخط دیا گیا وہ اردو کا نستعلیق ہی ہے، ساتھ ہی اس زبان میں تقسیم ہند کے بعد مختصر سی مدت میں نہ صرف شاعری، بلکہ نثر میں بھی مختلف اصناف میں زور آزمائی دیکھنے کو ملتی ہے۔ آج کے دور میں گوجری زبان ریاست کی ایک تیز تر ترقی کرنے والی زبان بھی ہے اور اس کا اندازہ ریاست میں ہو رہی ادبی سطح کی سرگرمیوں، سوشل میڈیا کی تحریکات میں شمولیت اور پرنٹ میڈیا میں اس کی اشاعت سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ 1969 میں ریڈیو کشمیر سرینگر سے گوجری پروگرام کا آغاز کیا گیا، اسی طرح 1975 میں جموں سے ریڈیو پروگرام اور 1978 میں جموں و کشمیر اکیڈمی برائے فن، ثقافت ولسانیات میں گوجری شعبے کا قیام، ساتھ ہی کلچرل اکاڈمی میں اس زبان کا شعبہ بھی اس زبان کی ترویج وترقی میں نمایاں رول ادا کرتے ہیں۔

ریاست جموں وکشمیر کے گوجری شاعر وادیبوں کی بات کریں تو بے شمار ایسے شاعر نظر آتے ہیں جنہوں نے اس زبان کی مختلف اصناف ادب میں طبع آزمائی کی ہے جن میں: نون پونچھی، چودھری خدا بخش زار، چودھری محمد اسرائیل مہجور، چودھری اکبر حسین اکبر (تراڑکھل)، چودھری حسن دین، رانا فضل حسین، چودھری نذیر احمد نذیر، ڈاکٹر صابر آفاقی، چودھری اقبال عظیم، چودھری ابرار احمد، چودھری غلام سرور، ڈاکٹر رفیق انجم، ڈاکٹر جاوید راہی، چودھری ایاز احمد سیف، چودھری محمد علی بیتاب، چودھری نثار راہی وغیرہ اہم ہیں۔

آخر میں اتنی بات وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اگر اس زبان کی طرف اہل علم و دانش وار دوداں طبقہ متوجہ ہوں اور اس زبان کے بولنے والوں، ساتھ ہی اس میں شامل لوک ادب جس کا بہت سارا حصہ ابھی تک عوام کی نظروں اور صفحۂ قرطاس سے محروم ہے، اس کو عوام کے سامنے لایا جائے تو اس زبان کی ترویج وترقی کا راستہ مستقبل میں بھی ہموار ہو جائے گا۔

☆☆☆

ڈاکٹر اِحسان حسن



مذہب، فلسفہ اور ادب

زندگی دراصل جذبات اور حقیقت کے درمیان چلنے والی ایک مسلسل جنگ کا نام ہے۔ جذبات یعنی جیسا کہ ہم چاہتے ہیں، سے حقیقت یعنی موجودہ معاملات و معمولات، کی موافقت پر خوشی اور ناموافقت پر غم کا مدار ہوتا ہے۔ دونوں ہی صورتوں یعنی خوشی اور غم کے حصول کو توازن کی لگام درکار ہوتی ہے۔ دراصل اسی توازن کی بقا کے لیے انسان کبھی مذہب، کبھی فلسفہ تو کبھی ادب کی پر پیچ اور لامحدود گلیوں میں صدیوں سے بھٹکتا، دربدر مارا مارا پھرتا چلا آرہا ہے۔ خوشی و سرمستی کے عالم میں کوئی ایسی غلطی نہ سرزد ہو جائے جو غموں کا سلسلہ قائم کر دے اسی لیے وقت وقت پر ہر دور میں مسرت کی میزان اقدار متعین کی گئی۔ اسی طرح دنیا کا کوئی بھی غم زندگی سے بڑا نہ ہونے پائے اور گھٹاٹوپ اندھیرے میں بھی روشنی کی آس باقی رہے یعنی زندگی بہر حال زندہ باد رہے! کے مقصد کے مدنظر مایوسی کو کفر قرار دیا گیا اور زندگی کے تحفظ کے لیے مذہب، فلسفہ اور ادب تینوں نے اپنے اپنے طور پر طرح طرح کے حربے استعمال کیے۔

تاریخ خواہ وہ آج کی ہو، کل کی ہو یا پھر صدیوں کی ہو، اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ مذہب کے نام پر اس دنیا میں انسانوں کا جتنا خون بہایا گیا ہے اور قتل و غارت گری وخوں ریزی کا دور دورہ چلایا گیا ہے ویسا کسی دیگر مقصد کے لیے کبھی نہ ہوا۔ آپ دلیل پیش کر سکتے ہیں کہ ایسا مذہب کے فلسفے کو نہ سمجھنے کی وجہ سے ہوا لیکن کیا ہم عوام الناس سے اس قسم کی توقع کر سکتے ہیں کہ وہ مذہبی روایات و رسومات کے پس پشت کارفرما مخصوص فلسفے اور مذہبی اقدار کی اصل مقصدیت کے عین مطابق مذہب سے اپنے اعتقاد کو مستحکم کریں؟ ہرگز نہیں، عوام عموماً معصوم ہوا کرتے ہیں۔ عوام کی یہ بنیادی فطرت ہوتی ہے کہ وہ دیکھا دیکھی ہی بہت سی چیزوں کی تقلید اور پیروی پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ مزید یہ کہ یہی تقلید اور پیروی نسل در نسل محض اس لیے پرورش اور تقویت پاتی چلی جاتی ہے کہ ''ہمارے بزرگوں نے ایسا ہی کہا اور کیا تھا''۔ اب یہ بات الگ ہے کہ عوام اس بنیادی حقیقت کو فراموش کر جاتے ہیں کہ ان کے بزرگوں نے جن زمانوں میں جیسا اور جو کچھ بھی کیا تھا تب میں اور اب میں تبدیلیوں کا ایک مکمل انقلاب برپا ہو چکا ہوتا ہے۔

عوام کی اسی جذباتی و نفسیاتی کمزوری سے ہر دور میں حکمراں طبقوں نے اپنے اپنے طور پر خوب سے خوب تر فائدہ اٹھایا ہے، جسے آج کی تکنیکی و سائنسی ایجادات کی لاکھ ترقی کے باوجود روکا نہیں جا سکا ہے۔ مختلف مذاہب گو فلسفیانہ سطح پر مماثلت کے تمام پہلوؤں سے آشکار ہو سکتے ہیں لیکن عوامی سطح پر اختلافات و مخالفت کا ایک مکمل سمندر ٹھاٹھیں مارتا رہتا ہے اور جس کی لہروں کو سیاست وقت وقت پر اپنی ضرورتوں کے مدنظر گھٹاتی بڑھاتی رہتی ہے۔ اور اس عمل میں وہ کسی بھی حد تک جا کر نام نہاد مخالف مذہب اور عقیدے کے لوگوں کے ساتھ مختلف قسم کے متشدد کارناموں کو انجام دے سکتی ہے۔ نام نہاد مخالف مذہب اور عقیدے اس لیے کہ اصلاً اور حقیقتاً اختلاف عوامی زندگیوں میں ہے ہی نہیں اور ایک مخصوص مشترکہ گزر بسر (Coexistence) کا سلسلہ صدیوں سے چلا آرہا ہے۔

> ''لاک نتیجہ یہ اخذ کرتا ہے کہ چونکہ انسانی ذہن مطلق صداقت کا تجربہ کرنے کی اہلیت سے محروم ہے لہٰذا فہمِ عامہ کے نام پر ہمارے لئے مناسب یہی ہے کہ ہر شخص کو حق دیں کہ وہ اپنے طریقے سے خدا سے عہدہ برآ ہو۔ جب تک کسی شخص کے اعمال عوامی بہبود میں رُکاوٹ نہیں ڈالتے اور معاشرے کے لئے خطرناک یا نقصاندہ ثابت نہیں ہوتے تب تک معاشرے کو اس امر کا حق نہ ہونا چاہئے کہ وہ فرد کے نجی ضمیر پر اپنے معیار نافذ کرے یا اپنے اعتقادات اُس پر ٹھونسے۔ ہر شخص کو اُس کے اپنے ضمیر کے مطابق اور اُس کے اپنے طریقے کے مطابق اچھائی کرنے کا موقع دیا جائے۔ معاشرے کے طرزِ عمل کو مشترکہ افادیت پر مبنی ہونا چاہئے۔ جو بات انسانوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد کے لئے خیر و برکت اور خوشی کا باعث ہو اُسی کو سب سے بڑی اچھائی سمجھ جانا چاہئے۔ ہر شخص کو اس کے اپنے ضمیر اور اپنے مذہب کی پیروی کرنے کا پورا حق ہونا چاہئے۔ حکومت یا معاشرے کو اس معاملے میں دخل اندازی سے باز رہنا چاہئے کیونکہ ان کو فرد کے ضمیر اور عقائد میں دخل دینے کا حق نہیں ہے۔ مسلمان ہوں یا ہندو، سکھ، عیسائی اور یہودی سب کے سب خدائی ارادے کی تکمیل کر رہے ہیں۔ بات یہ ہے کہ آنکھ جس شئے کو جانچ نہیں سکتی، اُس کو دل محسوس کر لیتا ہے۔ انسانی دل نیکی اور پاک بازی کے لئے ایسی اہلیت رکھتا ہے جو قابل برداشت حد تک کمال کے قریب جا پہنچتی ہے۔''

(20 عظیم فلسفی، از ہنری تھامس، ڈانالی تھامس، مترجم قاضی جاوید، ص155)

مذہب کی بھی اپنی ایک سیاست ہوتی ہے اور سیاست کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی، وارانسی۔221005
فون:9935352141 ehasan.hasanbhu@gmail.com

یہی وہ بنیادی امر ہے جس کی پیچیدگیوں کا شکار عوام ہوتے چلے آرہے ہیں۔ عوام فطرتاً معصوم ہوا کرتے ہیں۔ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ مذہب خواہ کوئی بھی ہو اور کہیں کا بھی ہو رفتہ رفتہ ہی سہی ایک مدت کے بعد ایسے مقام پر پہنچ ہی جاتا ہے جہاں سیاست کا تحفظ اُسے حاصل ہوتا ہے۔ نظامِ جمہوریت کی تاریخ کوئی بہت پرانی نہیں ہے لیکن دنیا میں مذہب، حکمرانی اور سیاست کی تاریخ بہت قدیم رہی ہے۔ مذہبی رہنما اور سیاسی رہنما دونوں کے ساتھ ایک چیز جو مشترک ہے وہ ہے اعتقاد، عوام کا اعتقاد۔ اعتقاد ایسی نفسیاتی سطح ہے جس کی تعمیر تبھی ممکن ہے جب اعتماد اور اعتبار دونوں بدرجۂ اتم موجود ہوں۔ اعتقاد مختلف وجوہ کی بنا پر ہوسکتا ہے۔ اعتقاد کے ساتھ ایک نزاکت یہ بھی ہوتی ہے کہ اس میں عقل کا دخل تقریباً نہیں ہوتا ہے۔ یعنی جن چیزوں کے ہم معتقد ہوتے ہیں اُن پر سوال کرنا ناجائز تصور کیا جاتا ہے۔ برس ہا برس سے عوام اِسی طرزِ تصور کے ساتھ مذہب اور سیاست سے نباہ کرتے چلے آرہے ہیں۔ وقت گزرتا ہے اور گزرتے وقت کے ساتھ بہت سی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ نئی نسلوں کی آمد ہوتی ہے۔ نئی نسلیں اپنے کندھوں پر اسلاف کے اعتقاد کا بار لئے زندگی میں آگے بڑھنے کی کوشش کرتی ہیں۔ ایسے میں اعتقاد اور موجودہ وقت کے تقاضوں کے مابین ایک تصادم بیدار ہونے لگتا ہے۔ یہ تصادم نئی نسل کے اندر ایک قسم کے ناسٹیلجیا کو جنم دینے لگتا ہے۔ جس کے نتیجے میں نئی نسل کی فکری و ذہنی تربیت کش مکش کا شکار ہو جاتی ہے۔ بس اسی کش مکش کا فائدہ سیاست مذہب کا واسطہ دے کر وقتاً فوقتاً اٹھاتی رہتی ہے۔ مذہب اپنی وسعت اور بقا کے لئے جن ذرائع کا استعمال کرتا ہے، سیاست انھیں مہیا کرانے میں مدد و معاون ثابت ہوتی ہے۔ مذہب اس خوش فہمی میں مبتلا رہتا ہے کہ ایک نہ ایک دن قلب ماہیت کے عمل سے گزر کر سیاست نہ صرف اس کی تابع ہو جائے گی بلکہ مذہبی اقدار کے آگے سیاسی سروکار بے معنی ہو جائیں گے۔ جب کہ بیک وقت سیاست کا سارا زور اس بات پر رہتا ہے کہ بہرصورت عوام کا مذہبی اعتقاد سیاسی حمایت میں تبدیل ہو جائے اور سیاست کو اپنے حصے کی کسرت نہ کرنی پڑے:

> ''ارسطو کا کہنا ہے کہ حکومت کا مقصد عوام کی فلاح و بہبود کو یقینی بنانا ہے۔ اس طرح سیاست اخلاقیات میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ مملکت کا وجود انسانوں کے لئے ہے۔ انسانوں کا وجود مملکت کے لئے نہیں ہے۔ انسان تو بس ایک ہی مقصد کے لئے پیدا ہوتا ہے.....اور وہ ہے خوش ہونا۔''

(20 عظیم فلسفی، از ہنری تھامس، ڈانالی تھامس، مترجم قاضی جاوید، ص38)

چونکہ فلسفہ عوام کی دسترس میں ہوتا نہیں اس لیے ادب کی اہمیت بڑھ جاتی ہے اور ادب کا کام، ادب کی ذمہ داری شعبہ ہائے حیات انسانی کے گوشے گوشے تک پھیل جاتی ہے۔ مذہب کا آکٹوپس کس طرح عوام کو اپنے شکنجے میں لے کر ان کے دل و دماغ کو رفتہ رفتہ مفلوج کرتا چلا جاتا ہے اور غور و فکر سے دور کر کے انھیں ایک عجیب و غریب خماری میں مبتلا کر دیتا ہے اور اسی خماری کو ادب اور آرٹ نہ صرف نشان زد کرتا ہے بلکہ اس خماری کو توڑنے اور بیداری پیدا کرنے کی کوشش بھی کرتا ہے۔ ایسے میں فلسفہ کو جو تقریباً روپوشی کی کیفیت میں مبتلا رہتا ہے اور اس کو پہچان پانے سے عوام قاصر رہتے ہیں، ادب اور آرٹ ہی اپنے مخصوص فارم کے ذریعہ عوام الناس تک پہنچاتے ہیں۔ مذہب، فلسفہ اور ادب کے مثلث میں ادب اوپری نقطے پر اور پھر ذیل کے دونوں نقطے مذہب اور فلسفہ کے بنتے ہیں۔ مجموعی طور پر دیکھیں تو عملی صورت پیدا کر پانے اور حرکت و حرارت سے تبدیلی رونما کرنے کی حالت میں ادب ہی نظر آتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ آج ادب کو آج کی آواز کا ترجمان بنانے میں ایمانداری کے ساتھ ہم سب ادب کے لوگ خواہ وہ ہندی، اردو، انگریزی، سنسکرت، مراٹھی، تیلگو یا پھر دیگر تمام تر ادبیات کے لوگ ہوں، ایک پلیٹ فارم پر آئیں اور مذہب کے فلسفے کو عوام تک پہنچادیں، عوام سیاست کے زہر سے محفوظ ہو جائیں گے۔ اس انقلابی عمل کے لیے جس اتحاد اور ایثار کی ضرورت ہے وہ بہرحال ہم کو دینا ہی ہوگا کیوں کہ آج جو ماحول نہ صرف ملکی بلکہ بین الاقوامی سطح پر بھی ادب کے خلاف بن رہا ہے اور جس قسم کی سازشیں ادب، آرٹ کے اظہار پر رچی جارہی ہیں وہ کب اور کتنی صفائی سے ہماری شناخت، ہمارے وجود کو ختم کر دیں گی، ہمیں پتہ بھی نہیں چلے گا!

رشید احمد صدیقی کا قول یاد آرہا ہے کہ ''ادب اور آرٹ بھی کربلا ہیں، جہاں شہادت نہیں تو کچھ نہیں!'' ہمارے سامنے اکابر کی مثالیں موجود ہیں۔ پریم چند نے کوئی بہت آرام و آسائش کی زندگی بسر نہیں کی۔ ان کے ساتھ مالی دشواریاں ہمیشہ رہیں مگر انھوں نے اصولوں سے کوئی سمجھوتہ نہیں کیا۔ علامہ اقبال بھی بہت پیسے والے کبھی نہیں رہے۔ سوریہ کانت ترپاٹھی نرالا اور دیگر بے شمار شاعر و ادیب مختلف زبان و ادب میں موجود ہیں جنھوں نے ادب اور فن کو ایک نشتریت عطا کی۔ تمام دشواریوں اور تنگ دستیوں کے باوجود فارغ البالی کی طرف مائل نہیں ہوئے۔ تلسی داس کو بادشاہ اکبر نے اپنے دربار سے وابستہ ہونے کی دعوت دی مگر بادشاہ وقت اکبر کی پیش کش کو تلسی داس نے ٹھکرا دیا اور آزادانہ طور پر زندگی بسر کرتے ہوئے اپنے فن کو جلا دینے کو ترجیح دی۔

غرض یہ کہ ادب کو اپنی مقصدیت کی تابع داری کا علم بردار ہونا ہوگا۔ اس ضمن میں عوامی ادب یعنی Folk literature خواہ وہ کسی بھی زبان کا ہو ہمارے لیے بنیادی اہمیت کا ثابت ہوسکتا ہے کیوں کہ عوامی ادب میں نہ صرف باہمی گزر بسر کا سلیقہ اور فہم اولیت میں ہوتے ہیں بلکہ باہمی اتحاد کی مخالف طاقتوں کے خلاف احتجاج و اختلاف کی آوازیں بھی ساتھ ساتھ سنائی دیتی ہیں۔ اس ضمن میں پریم چند کے اس قول کی معنویت کو فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ ''ادب سیاست کے آگے آگے چلنے والی مشعلِ ہدایت کا نام ہے۔'' بالخصوص عوامی ادب جو مخصوص خطے کے عام انسانوں کی آرزوؤں اور امنگوں کا ترجمان ہوتا ہے، نہ صرف صداقت کی معصومیت سے لبریز ہوتا ہے بلکہ فکری و نظریاتی عیاریوں سے بھی پاک ہوتا ہے۔ ایسا ادب فطرت کے عین مطابق یعنی نیچرل ہوتا ہے۔ چونکہ یہ ادب عوام میں رچا بسا اور ہر دلعزیز ہوتا ہے لہٰذا اس کی شدت کی تندی و توانائی سیاست کی سمت متعین کرنے میں اہم رول ادا کرسکتی ہے۔ اب یہاں پریم چند کے اوّل الذکر قول کے ذیل میں آنے والے مزید دو اقوال کو بھی سمجھ لینے کی ضرورت ہے، ''ادیب غیر جانب دار نہیں'' اور ''سیاست میں عملی حصہ''۔ ان دونوں کا تعلق بھی براہِ راست ادب اور ادیب سے ہے۔ ادب دراصل ذہن سازی کی قوت رکھتا ہے اور یہ قوت مختلف پہلوؤں سے کارفرما ہوتی ہے۔ ادب

خواہ وہ کوئی بھی ہو اُس کے مرکزی دھارے میں بہت سے چھوٹے چھوٹے لسانی، عوامی اور مقامی دھارے آکر ملتے ہیں۔ مرکزی ادب کتنا متنوع، کشادہ اور مؤثر ہوگا اس کا مدار بڑی حد تک انہی دھاروں پر ہوتا ہے۔

سیاست، مذہب کا استعمال جس کاریگری سے اپنے مقصد کے لیے کرتی ہے اس کی گرفت اور اس پر ضرب کاری ادب کو ہی کرنی ہے۔ ادب کا دائرہ بہت وسیع ہے اور آج کے تکنیکی دور میں جب کہ انٹرنیٹ اور اسمارٹ فون کا دور دورہ ہے، ادب کی رسائی فیس بک، وہاٹس اپ اور اسی قسم کے دیگر ذرائع سے مزید سے مزید تر ہوتی جارہی ہے۔ اس سہولت کے دونوں پہلو ہیں مثبت اور منفی۔ ایسے میں ادب کی تخلیقی ذمہ داری اور تخلیقیت کی سنجیدگی اور معیار پر بحث ضروری ہوجاتی ہے۔ جیسا کہ ابتدا ہی میں عرض کیا گیا کہ سارے جھگڑے اور فساد اس لیے ہیں کہ عوام نے مختلف مذاہب کے پس پشت کارفرما فلسفے کو سمجھنے پر زور نہیں دیے۔ اب ادب کا کام ہے کہ وہ اپنی فنی و تخلیقی قوت کا استعمال کرکے اس کارہائے نمایاں کو انجام دے۔ کیونکہ ادب ہی وہ میڈیم ہے جس کے ذریعے مذاہب کے فلسفے کو عوام تک بآسانی پہنچایا جاسکتا ہے۔ اس عمل میں ترسیل کی ناکامی اور تاثیر کی محرومی جیسے خطرات کی گنجائشیں بھی کم ہوجاتی ہیں کیوں کہ ہم ادب کے ذریعہ اپنی بات عوام تک پہنچانے جارہے ہیں جو بذاتِ خود اظہار کا ایک بہت مضبوط میڈیم ہے۔

''یہ صرف تخلیقی عقل ہی ہے..... جو عام آدمی کا وجدان اور شاعر کی تخلیقی تحریک سے عبارت ہے..... جو کسی خاص لمحے پر، کسی مقام سے اور کسی بھی قسم کے حالات میں کل حقیقت کو قابو میں لے سکتی ہے۔ سبب اس کا یہ ہے کہ تخیلی ذہن تو صرف زمانۂ حال میں عمل کرسکتا ہے جب کہ تخلیقی ذہن خود میں ارتقا کو سموئے ہوتا ہے..... اس سے مراد نمو ہے..... گویا تخلیقی ذہن میں پورا ماضی، حال اور مستقبل شامل ہوتا ہے۔

تخلیقی عقل کے اس داخلی شعور کی ارتقائی نمو ہی زندگی ہے۔ یہ وہ برقی رَو ہے جو ہم سب میں جان ڈالتی ہے اور متحرک کردیتی ہے۔ برگساں نے اس کو ایک خوبصورت عنوان دیا ہے۔ وہ اس کو ''جوشِ حیات'' کہتا ہے۔''

(20 عظیم فلسفی، از ہنری تھامس، ڈانالی تھامس، مترجم قاضی جاوید، ص321)

اس طرح ادب کے تعلق سے جو بات سب سے اہم اور نازک ہے بالخصوص ہندوستان کے پس منظر میں وہ یہ کہ ایک طرف ہماری آنے والی نسلوں کے مستقبل کا سوال ہے، ان کی ذہنی و فکری تربیت کا سوال ہے، ان کے طرز تصور کا سوال ہے، آنے والے سماج کی تعمیر کا سوال ہے اور دوسری طرف ہمارے اپنے چھوٹے بڑے فوری مفادات کا سوال ہے۔ اب اہل ادب کو یہ طے کرنے میں دیر نہیں کرنی چاہیے کہ آخر وہ کس سوال کے ساتھ کھڑے ہیں؟

''والٹیر نے دنیا میں مذہبی عدم رواداری کو کم کرنے کے لئے بہت کچھ کیا۔ اس نے مذہبی عبادت میں عدم مداخلت کا اصول ہمیشہ کے لئے قائم کردیا۔ اس نے کلیسا سے جنگ جوئی کو نکال کر اس کی جگہ اخلاقیات کو رکھ دیا۔ اس کی عملی زندگی کے ابتدائی حصے کا ماٹو یہ رہا تھا کہ ''ہنسو اور ہنسنے دو''۔ اب اس نے یہ پرانا ماٹو بدل دیا اور اس کی جگہ ایک زیادہ سنجیدہ اور زیادہ روشن خیال ماٹو اختیار کیا جو یہ تھا کہ..... سوچو اور سوچنے دو۔''

(20 عظیم فلسفی، از ہنری تھامس، ڈانالی تھامس، مترجم قاضی جاوید، ص194)

سیاست میں صاحبِ اقتدار ہونا اور پھر ایک بہتر نظامِ حیات کی بقا کے لئے کس قسم کے ایثار کی ضرورت ہوتی ہے، اس کا اندازہ افلاطون کی اس فکر سے لگایا جاسکتا ہے:

''بات یہ ہے کہ مثالی مملکت پر ہمیشہ ہی بہترین افراد کی حکمرانی ہونی چاہئے۔ افلاطون کی جمہوریہ میں تربیت اور فطری اہلیت دونوں کے اعتبار سے فلسفی اُن بہترین مردوں اور عورتوں میں سے بھی قابل ترین ہوتے ہیں جو مملکت پیدا کرنے کے قابل ہوتی ہے۔ یہ فلسفی حکمران اعلیٰ ترین طبقہ بناتے ہیں۔ ضروری ہے کہ مملکت کے باقی دونوں طبقے ہمیشہ اُن کی اطاعت کریں۔ ان حکام کی دیانت داری کو یقینی بنانے کی خاطر افلاطون کی تجویز یہ ہے کہ اُن کو نجی جائیداد رکھنے کا حق حاصل نہ ہونا چاہئے۔ اُن کی ہر شے مشترک ہونی چاہئے۔ وہ کھانے کے مشترکہ کمروں میں کھانا کھایا کریں گے اور اکٹھے ہی بیرکوں میں سویا کریں گے۔ ذاتی مفادات نہ ہونے کے سبب یہ حکمران بدعنوانی سے پاک ہوجائیں گے اور اُن کی بس ایک ہی لگن رہ جائے گی..... اور وہ یہ ہے کہ انسانوں کے درمیان انصاف قائم کرنا اور اُس کو برقرار رکھنا۔''

(20 عظیم فلسفی، از ہنری تھامس، ڈانالی تھامس، مترجم قاضی جاوید، ص25-24)

سیاست اور مذہب دونوں میں ایک خاص قسم کا رتبہ کام کرتا ہے جو کوئی ضروری نہیں کہ خود کا تعمیر کردہ ہو۔ لیکن ادب میں اس کی گنجائش نہیں ہوتی ہے۔ ادب کا جلوہ تبھی ظاہر ہوتا ہے جب خود ادیب کا جلال متحرک اور معتبر ہو۔ یہی وہ مقام ہے جہاں ادب، سیاست اور مذہب دونوں سے الگ ہوجاتا ہے اور بیک وقت ''ادب ایک آلۂ کار'' کی حیثیت سے مذہب اور سیاست دونوں کے لئے مشعلِ راہ بن جاتا ہے۔ مگر افسوس کہ ادب کی اِس آفاقیت اور اثر پذیری سے خود ادب کے اپنے لوگ ہی غافل ہیں۔

کتابیات:

۱۔ 20 عظیم فلسفی، از ہنری تھامس، ڈانالی تھامس، مترجم قاضی جاوید، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

۲۔ اردو شاعری میں قومی یکجہتی کے عناصر، از مجاور حسین رضوی، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ

۳۔ مذہب اور ہندوستانی مسلم سیاست کل اور آج، از پروفیسر مشیر الحق، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی

۴۔ مارکسی فلسفہ، اشتراکیت اور اردو ادب، از پروفیسر وہاب اشرفی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

۵۔ تفسیر اُمّ الکتاب، از مولانا ابوالکلام آزاد، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، دہلی

۶۔ ہندو مذہب مطالعہ اور جائزہ، از پروفیسر محسن عثمانی ندوی، قاضی پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز، نئی دہلی

۷۔ ویدک دھرم اور اسلام، از اصحاب علی، مشرا ٹریڈنگ کارپوریشن، وارانسی

☆☆☆

محمد عارف





سریندر پرکاش کی اساطیری کائنات

سریندر پرکاش اپنے افسانوں میں معاملات کی گرہ بندی اوران کی پیشکش میں اپنا منفرد مقام رکھتے ہیں۔ان کے افسانے ان کے نجی تجربات کی آماج گاہ ہیں کیوں کہ ان کے افسانوں میں ایک الگ رنگ ہے اسی وجہ سے وہ فکری سطح پر دوسروں سے منفرد نظر آتے ہیں۔ان کے یہاں جو درد و کرب ملتا ہے وہ کسی حد تک ایسے شعوری جذبات و ہیجانات کی منظر کشی کرتا ہے جس کے ان مٹ نقوش ان کی ذات کا حصہ بن گئے ہیں۔اسی لیے ان کے یہاں اشاراتی زبان کے ساتھ مشکل پسندی بھی دیکھی جاسکتی ہے لیکن الفاظ کا بہاؤ اس خاص اسلوب کو بوجھ نہیں بننے دیتا مگر ان کا اسلوب اور اشاریت پسندی انھیں صاف اور واضح الفاظ استعمال کرنے سے روک لیتا ہے۔انھوں نے اساطیر کے ذریعے سیاسی، سماجی اور معاشرتی مسائل کی بدکرداریوں اور بدعنوانیوں پر سخت تنقید کی ہے۔ 'رونے کی آواز'، 'خشت و گل'، 'رہائی کے بعد'، 'نئے قدموں کی چھاپ'، 'آپ بیتی'، 'پوسٹر'، 'بدوشک کی موت'، 'پیاسا سمندر'، 'رات روتی ہے' وغیرہ۔یہ وہ افسانے ہیں جن میں اساطیری اور دیومالائی عناصر پائے جاتے ہیں۔پہلے اساطیر کے بارے میں کچھ باتیں ملاحظہ کریں۔

'اساطیر' کہ جس کا مادہ سطر (س۔ط۔ر) ہے عربی زبان کا لفظ ہے۔یہ 'اسطورہ' کی جمع ہے۔اساطیر کے علاوہ اردو میں 'دیومالا' کی مترادف اصطلاح بھی موجود ہے جس کو انگلش میں Myth کہا جاتا ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا اپنی کتاب 'تخلیقی عمل' میں اساطیر کو دیوتاؤں کے کارناموں سے جوڑ کر دیکھتے ہیں۔ان کے یہاں یہ اساطیر وہ پرانے قصے اور کہانیاں ہیں جنھوں نے اساطیر کا درجہ حاصل کرلیا، وہ اساطیر کے بارے میں اس طرح رقمطراز ہیں:

> ''اسطور یا متھ (Myth) یونانی زبان کے لفظ مائی تھوس (Mythos) سے ماخوذ ہے جس کا لغوی مفہوم ہے، 'وہ بات جو زبان سے ادا کی جائے' یعنی کوئی قصہ یا کہانی۔ابتداءً اسطور کا یہی تصور رائج تھا لیکن بعد ازاں کہانی کی تخصیص کردی گئی۔یوں کہ اسطور اس کہانی کا نام پایا جو دیوتاؤں کے کارناموں سے متعلق تھی یا ان شخصیتوں کی مہمّات کو بیان کرتی تھیں جو زمین پر دیوتاؤں کی نمائندہ تھیں۔''

(ڈاکٹر وزیر آغا، تخلیقی عمل۔دیومالا کی بنت میں، انٹرنیشنل اردو پبلی کیشنز، نئی دہلی، پہلا ایڈیشن، 2005، ص41)

ڈاکٹر قاضی عابد علی نے اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے ''اردو افسانہ اور اساطیر'' میں اساطیر کو ایک ایسی کہانی سے تعبیر کیا ہے جس میں قدیم انسانی ثقافتی رہن سہن کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔قاضی عابد علی نے اپنے اس مقالے میں اساطیر کو مکمل طور پر واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔وہ اساطیر کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''اسطورہ یا اسطور (دیومالا) ایک ایسی مقدس کہانی ہوتی ہے جو فوق البشر روحانی ہستیوں کے کائنات میں عمل دخل، رسوم و رواج، رہن سہن اور کائنات کے ساتھ ان کے تعلق کو بیان کرتی ہے۔یہ فوق البشر ہستیاں دیوی دیوتا اور انسان دونوں ہوسکتے ہیں۔کائنات میں ان کا رہن سہن جس معاشرت اور ثقافت کو جنم دیتا ہے، اسطورہ اس کا بیان بھی کرتی ہے اور وضاحت بھی۔رہن سہن خواہ انسان کا ہو یا دیوی دیوتاؤں کا، ثقافتی ہیئت خواہ ماورائیت میں لپٹی ہوئی ہو یا نہ ہو اسطورہ ماورائیت میں لازماً ملفوف ہوتی ہے۔نیز انسانی معاشروں میں جنم لینے والی فکری وحدانیت کو بھی کسی نہ کسی سطح پر سامنے لاتی ہے۔''

(ڈاکٹر عابد علی، اردو افسانہ اور اساطیر، مجلس ترقی ادب لاہور، 2009، ص33)

سریندر پرکاش کے افسانوں میں علامت و استعارہ کے علاوہ اساطیر اور ہندو میتھالوجی عناصر کی بھرمار بھی دکھائی دیتی ہے۔وہ اپنے افسانوں میں کردار نگاری اور منظر نگاری سے کوئی تھیم ترتیب دیتے ہیں اور پھر اُس تھیم کے ذریعے جب وہ کسی کردار کو اسطوری جامہ پہناتے ہیں تو وہ کردار ماضی سے حال میں آیا ہوا معلوم پڑتا ہے۔اسی وجہ سے ان کے افسانے اپنی منفرد شناخت اور ادب میں ایک اعلیٰ مقام کی حیثیت رکھتے ہیں۔سریندر پرکاش کے افسانے ایک نئے طرز اور ایک نئے فکری رویے کو پیش کرتے ہیں جہاں وہ اس روایت سے انحراف کرتے ہوئے نظر آتے ہیں جو دوسرے افسانہ نگاروں خاص کر ترقی پسندوں کے یہاں دیکھنے کو ملتی ہے۔وہ اسطوریت، تمثیلیت، علامت کی پراسراریت سے اپنے افسانوں کا تانا بانا بنتے ہیں۔جن میں حیرت و استعجاب بھی ہے اور طنز و مضحکہ خیزی بھی، وقت کی سیاسی بدحالی بھی ہے اور معاشرے کی بدعنوانی کے بدلتے ہوئے مناظر کی پیشکش بھی۔سریندر پرکاش کا فن ایک ایسی ہی منطقیت سے بُنا ہوا ہے جو بظاہر مایوس کن مگر اپنے اندر گہرے جذبات لیے ہوئے ہے۔ان کے افسانے علامتوں اور اساطیر کا ایک جال ہیں، جہاں ایک طرف ان کی علامتوں میں تحت الشعوری کاوشیں جلوہ گر ہیں تو وہیں دوسری طرف یہ اساطیر انسان کو اپنی عظیم اور عزیز اقدارِ ماضی سے جوڑتی ہوئی نظر آتی ہیں کیونکہ یہ اساطیر مستحکم اور ان مٹ ہوتی ہیں جن سے انسان کا رشتہ استوار ہو سکتا ہے اور پھر اس رشتے کے ذریعے انسان، قدیم مذہبیات، قدیم کلچر اور قدیم فنونی اقدار سے باخبر ہوسکتا ہے جس میں شخصی حسیت اور جذباتی مناظر کی عکاسی ہوتی ہے، اسی

محلّہ انصاری، وارڈ نمبر 8، نزد جی او ٹاور، فتح گنج، ویسٹ بریلی۔243501
فون:7897184132 ma9815330@gmail.com

وجہ سے سریندر پرکاش کے یہاں ان اساطیر کی اہمیت مسلّم ہے۔

سریندر پرکاش کے یہاں اسطوریت کی فراوانی ہے اور وہ ان اساطیر کے آئینے میں ماضی کی عظیم اقدار کو دورِ حاضر کی بدحالیوں اور بدعنوانیوں کو سامنے رکھ کر دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں جن میں ان کو بُعدِ زمانی کے ساتھ ساتھ ایک غیر معمولی بدلاؤ نظر آتا ہے۔اس لیے وہ ان اساطیر کے ذریعے ان مقدس اقدار کی حمایت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ جب انسان ،انسان تھا، برائیوں سے دور اور آپس میں الفت ومحبت بانٹتا تھا وہ سب عہدِ حاضر میں ختم ہو چکا ہے،مغرب زدگی نے ہندوستانی تہذیب کو برباد کر دیا،صلہ رحمی، بھائی چارہ اور امن وامان چھن چکا ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ قدیم اساطیری روایات کی تشکیل سے دنیا کو ایک نئی امید اور ایک نیا نظریہ دینا چاہتے ہیں جس میں اساطیر کے ذریعے ان تمام برائیوں اور بدعنوانیوں کی طرف اشارہ ہے جو کسی بھی شخص میں ایک ذات کا روپ لے چکی ہیں،سریندر پرکاش کے یہاں اِن اساطیر کا تحرک اس لیے ہے کہ زمانے نے ان اساطیر کو اپنی توجہ کا مرکز نہیں بنایا،اسی بارے میں مہدی جعفر لکھتے ہیں:

''سریندر پرکاش کی اساطیر اور علامتی تخلیقات کا خاص تحرک وہ ازلی اور بنیادی انسانی شعور ہے جسے دنیا کی سیاست ہمہ وقت کچلنے کے درپے ہے۔''

(مہدی جعفر،عصری افسانے کا فن،سریندر پرکاش کی قصہ جاتی اسطوریت،معیار پبلی کیشنز دہلی،1998،ص80)

سریندر پرکاش نے اپنے افسانوں میں جس قدر اساطیر سے استفادہ کیا ہے وہ ان کا اپنا کمالِ درجہ کا شعوری حصہ ہے۔ان کے افسانے اِنہی اساطیر کے گرد گھومتے ہیں جن میں انسانی شعور کو بیدار کرنے کی قوت ہوتی ہے۔ان کا افسانہ ''رونے کی آواز'' جو شعور کی رو کی تکنیک میں لکھا گیا ہے یہ واحد متکلم کی خود کلامی کے تانے بانے سے بُنا گیا ہے اور وہ متکلم خود جدید معاشی ومعاشرتی مسائل سے افسردہ اور دوچار ہے۔درد وکرب، مایوسی اور بے چینی کا شکار ہے۔اس افسانے میں وشنو بابو کا کردار ایک مایوس اور افسردہ انسان ہے جو علم وادب کی آگہی کے لیے نہیں بلکہ دولت وثروت کے لیے جینا پسند کرتا ہے جو اس کے حساب سے وقت کا تقاضہ بھی ہے۔اس افسانے میں اسطوری فضا قائم کرنے کے لیے اساطیری کردار 'سرسوتی' اور 'لکشمی' استعمال کیے گئے ہیں اور ان اساطیر نے زمانے کی کج فہمی، پیسے کی غلامی اور غیر علمی ہم مزاجی پر ضرب کاری کا کام کیا ہے۔اس افسانے میں دکھایا ہے کہ وشنو بابو پہلے 'سرسوتی' جو علم کی دیوی ہے، سے شادی کرتا ہے اور بعد میں وہ سرسوتی کو روتا ہوا چھوڑ کر 'لکشمی' جو دھن کی دیوی ہے، سے شادی رچا لیتا ہے،اس کی منظر کشی کچھ اس طرح کرتے ہیں:

''بہت سال پہلے جب وہ بالکل معمولی آدمی تھے تو انھوں نے ایک لڑکی سے شادی کی تھی۔جس کا نام ''سرسوتی'' ہے۔پھر اچانک وشنو بابو ایک مال دار عورت 'لکشمی' سے ٹکرا گئے۔تب انھیں اپنی غلطی کا احساس ہوا اور انھوں نے ''لکشمی'' سے اپنا دوسرا بیاہ رچا لیا۔اب لکشمی اور وشنو بابو دونوں آرام سے زندگی بسر کرتے ہیں اور بے چاری 'سرسوتی' رات رات بھر سیڑھیوں میں بیٹھ کر روتی رہتی ہے۔اسی ہنگامے کی وجہ سے میں بھی ابھی تک طے نہیں کر پایا کہ مجھے کسی سرسوتی سے شادی کرنی چاہیے یا کسی لکشمی سے!''

(رونے کی آواز،ص16 تا17)

مہدی جعفر اپنے مضمون میں اس افسانے کی تھیم اور اِس کی فضا سازی جو استعاراتی انداز میں ہے، کے متعلق لکھتے ہیں:

''رونے کی آواز'' میں لکشمی کی سرسوتی کے ساتھ اپنائیت کے سلوک میں فرق آنا اور سرسوتی کا باہر بیٹھ کر رونا داخلی 'دوسرے پن' کی علامت بن جاتا ہے، لکشمی کی بلند ہوتی اور سرسوتی کی غیر اہم ہوتی ہوئی حیثیتوں کو آج کے بین الاقوامی اور سیاسی تناظر میں اور بھی شفاف طریقے سے دیکھا جاسکتا ہے۔''

(ایضاً۔ص81)

سریندر پرکاش نے اپنے افسانوں کے ذریعے حالاتِ حاضرہ کی کہن پوشی پر نشتر زنی کی ہے،ان کا افسانہ ''خشت وگل'' اسی نوعیت کا ایک منفرد اور حساسی کیفیت کا حامل افسانہ ہے جو اپنے اندر ایک اسطوری بازگشت لیے ہوئے ہے،جس میں انسان کی بدفعلی اور اس کی بدکرداری کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔اس افسانے میں برہما، وشنو اور مہیش جن کو 'تری مورتی' کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے، جن کی حیثیت ہندو ازم میں اہم بھگوان کی ہے، سے اسطوری فضا قائم کی گئی ہے ساتھ میں حضرتِ نوحؑ کے ساتھ اس پورے افسانے کی تھیم تیار کی گئی ہے، میرے خیال سے یہ افسانہ نوحؑ کی اساطیر سے ان کے زمانے کے لوگوں کی بدحالی اور عیاری و مکاری کی طرف بھرپور توجہ دلاتا ہے جن عیاشیوں اور مکاریوں کی وجہ سے طوفانِ نوح یعنی دنیا کا عظیم ترین عذاب نازل ہوا جس میں پوری دنیا غرقاب ہوئی۔سوائے کچھ اچھے لوگوں کے، جو کشتی نوح میں سوار ہو گئے تھے،اس افسانے میں اُنہی چیزوں کو عصر حاضر کی مکاریوں،عیاشیوں اور بدعنوانیوں کے تناظر میں دیکھنے کی سعی ہے۔یہ افسانہ ایک گہری معنویت میں ڈوبا ہوا ہے:

''سب کچھ طے ہو گیا ہے بس اب یہ پوچھنا باقی ہے کہ نوح پھر کب آئیں گے، سبھی کچھ ہے سوائے نوحؑ کے.....اور نوح کا انتظار ہو رہا ہے۔پھر کشتی روانہ ہو جائے گی۔''

(خشت وگل،ص35)

اس کے بعد آنے والی چیزیں افسانے کو بہت متاثر کن بناتی ہیں۔ان میں یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ جب مقدس ہستیاں آپسی تناؤ اور جنگ وجدال کا شکار ہو جائیں تو پھر اصلاح اور امن وامان کی کوئی صورت باقی نہیں رہتی اور انسانوں کی ذات اور مقدسیت پامال ہو جاتی ہے:

''میں بے بس ہوں،ایسا لگتا ہے جیسے میری کھال بہت چکنی ہے جس پر سے ہر چیز پھسلتی ہوئی نکل جاتی ہے اور پھر بکھر کر تین حصوں میں بٹ جاتی ہے۔۔برہما، وشنو، مہیش، میری ساری سرشٹی ان تین بھائیوں نے بانٹ لی ہے اور میرے تین ٹکڑے کر کے تین مندروں کی ڈیوڑھیوں میں کھڑے کر دیے ہیں۔میں ان دیوتاؤں کے بارے میں بالکل غیر جانب دار رہنا چاہتا ہوں۔مگر جب ان کا آپس میں یُدھ ہوتا ہے تو میں مرجاتا ہوں۔جب میں مرجاتا ہوں تو ان کے مندر کھنڈت ہو جاتے ہیں پھر وہ میرے پاس بُدھ بن کر آتے ہیں اور مجھے نیا مندر بنانے کے لیے کہتے ہیں۔''

(ایضاً۔ص37)

اس طرح یہ افسانہ پہلے والے پیراگراف جیسے جملے 'سب کچھ تیار ہے بس اب نوحؑ کا انتظار ہو رہا ہے' سے اختتام کی طرف بڑھ جاتا ہے۔سریندر پرکاش نے اس افسانے میں اساطیری کرداروں سے انسانی بے چینی اور اس کے درد وکرب کو پیش کیا ہے۔مرکزی

علامت کشتی نوحؑ سے ایک نئی کہانی کو جنم دیا گیا ہے۔

اسی ضمن میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ سریندر پرکاش کے یہاں لفظ 'سمندر' کا استعمال کثرت سے کیا گیا ہے۔اس لفظ سے ان کا اشارہ ایک پُر اسرار گہری معنویت اور گہرے لاشعوری جذباتی تلاطم کے اظہار کی طرف ہے۔ان کے افسانوں کو پڑھنے سے لگتا ہے کہ وہ ایک پراسرار گہرائی میں بیٹھے ہوئے کچھ سوچ رہے ہیں۔اس لفظ کا استعمال اِسی لاشعوری قوت کی طرف اشارہ کرتا ہے جو ہندوازم میں ان کے بھگوان وشنو کی خصوصیت ہے، وہ گہرے جذبات کی علامت ہیں اور وہ سمندر میں رہتے ہیں اور یہ سمندر گہرے پراسرار جذبات کی منظر کشی کرتا ہے۔

سریندر پرکاش کے افسانوں میں اسطوری فضا ایک معنویت اور ایک منطقیت کے تحت قائم کی گئی ہے۔وہ بڑی ہی خوش اسلوبی سے ایک ہی افسانے میں اساطیر کو تمثیلی اور علامتی روپ دے کر استعمال کرتے ہیں۔سریندر پرکاش کے یہاں موضوعات کا تنوع پایا جاتا ہے جس کا احساس ان کے ہر افسانے کو پڑھ کر لگایا جا سکتا ہے۔ان کا افسانہ ''نئے قدموں کی چھاپ'' میں ایک بیانیہ انداز کو اپنایا گیا ہے۔اس افسانے میں سریندر پرکاش نے دونسلوں کے باہمی جذباتی اختلافات کو پیش کیا ہے۔اس افسانے میں اساطیری کردار 'ہابیل اور قابیل' کا ذکر کیا گیا ہے، جن کے ذریعے مصنف نے آپسی الفت ومحبت، بھائی چارہ، خلوص اور اخوت کے خاتمے کی طرف بلیغ اشارے کیے ہیں۔یہ افسانہ دورِ حاضر میں رشتوں کی ناقدری اور گرتی ہوئی انسانی شخصیت کی عکاسی کرتا ہے۔ ہوس، جنس، لالچ اور مال و دولت نے آپ میں حسد کا بیج بو دیا ہے۔ان چیزوں نے انسانی رشتوں کی اہمیت کو ختم کر دیا ہے۔اس افسانے میں ایک اہم چیز یہ بیان کی گئی ہے کہ جب خونی رشتے کے بھائی بہن میں بغض وحسد کی وجہ سے دشمنی پیدا ہو سکتی ہے تو وہ رشتے جو صرف انسانیت کی بنا پر بنتے ہیں پھر ان کی کیا اہمیت ہوگی۔اسی اہم نکتے کی طرف یہ افسانہ، قاری کی توجہ مبذول کراتا ہوا نظر آتا ہے:

> ''میرے آگے جو کتاب ہے اس میں قابیل اور ہابیل کی کہانی ہے۔ کتاب میں سے ایک انگلی ابھرتی ہے اور میرے سینے پر آ کر ٹک جاتی ہے، پھر جیسے میرے سینے پر ٹھوکا دیتی ہے۔کیا میں قابیل ہوں؟ کیا میں نے اپنے بھائی ہابیل کو اپنے کھیتوں میں ہی قتل کر ڈالا جن میں، میں نے پہلے پہل فصل اُگائی تھی؟ خداوند مجھ سے پوچھتا ہے، تمہارا بھائی کہاں ہے؟ ''اور میں چلا کر پکار اٹھتا ہوں'' کیا میں اپنے بھائی کا محافظ ہوں۔''

(نئے قدموں کی چھاپ۔ص50)

کہا جاتا ہے کہ انسان اپنے اچھے کرموں کی وجہ سے دیوتا کا مرتبہ حاصل کر سکتا ہے مگر عصر حاضر کی بدحالی و بدعنوانی کہ جہاں انسانی اقدار اپنی آخری سانسیں لیتی ہوئی نظر آتی ہیں اور جس میں رشتوں کی اہمیت گھٹ کر صفر ہو چکی ہے، تو اس ماحول میں انسان بھگوان تو کجا، ایک اچھا انسان بھی نہیں بن سکتا۔

سریندر پرکاش نے صرف معاشی، معاشرتی اور سماجی وسیاسی حالات پر ہی نقب زنی نہیں کی ہے بلکہ انھوں نے پیار، محبت والفت اور اس کی پاکیزگی وروحانیت پر بھی لکھا ہے۔ اساطیر اور علامتوں کے استعمال سے اس پاکیزہ رشتے کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے جو رشتہ روح سے استوار کیا جاتا ہے یعنی روایتی محبت سے ہٹ کر خالص روحانی پیار کے ذریعے کہانی کو پیش کیا گیا ہے۔افسانہ ''پیاسا سمندر'' ایسا ہی رومانوی طرز پر لکھا ہوا ہے جو محبت کے پاکیزہ رشتے کے جذباتی بہاؤ کو پیش کرتا ہے۔اس افسانے میں پنڈت جی کا کردار مہابھارت کے دریودھن سے مستعار ہے۔اس کردار کے ذریعے وہ پیار کی اس معنویت کو پیش کرنا چاہتے ہیں جس پیار میں گاندھاری اپنے اندھے شوہر کے لیے ساری عمر اپنی آنکھوں پر پٹی باندھی رہتی ہے۔اس کا لڑکا دریودھن جس کی زندگی کی حفاظت کے لیے گاندھاری نے اس کو اپنے سامنے برہنہ آنے کو کہا تھا تا کہ اس کی آنکھیں جو روشنی کی قوت سے بھرپور ہیں اس پر پڑنے سے وہ امر ہو جائے مگر دریودھن نے ایسا نہیں کیا تو وہ اپنے جسم کے کچھ حصوں کی کمزوری سے مر گیا، یہی چیز پنڈت جی کے کردار کے متعلق دکھانے کی کوشش کی ہے کہ پنڈت جی نے بھی ویسا ہی کیا جیسا دریودھن نے کیا تھا۔یہ افسانہ محبت کے جذباتی تلاطم کی عکاسی کرتا ہے۔لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ پنڈت جی کی پیاس نہ تو اپنی محبوبہ سے بجھی اور نا ہی اس لڑکی سے جس کی وجہ سے انھوں نے کھڑکی سے کود کر جان دی تھی:

> ''پنڈت جی نے کاغذ تپائی پر رکھ دیے اور اٹھ کر اپنے سوٹ کیس کی طرف گئے اس میں سے انھوں نے ٹین کا ایک گلابی ساڈبہ نکال کر ایک زرد رنگ کا لفافہ نکالا، پھر اس میں سے دو کارڈ سائز کے فوٹو نکالے اور انھیں گلاسوں کے سہارے تپائی پر رکھ دیا۔کچھ دیر تک وہ ان کی طرف جھک کر دیکھتے رہے۔پھر اپنا کرتہ اور انگوچھا اتار کر ننگ دھڑنگ ان تصویروں کے سامنے سیدھے کھڑے ہو گئے۔''

(پیاسا سمندر، ص165)

''دیوی شبھ!

میں تمہارے لیے اوشیہ ہی اپرجت ہوں۔پنڈت جی یہاں میرے ہی پاس ٹھہرے ہوئے تھے۔اب وہ اس سنسار میں نہیں ہیں۔وہ ایسا ہی دریودھن تھے، جو زندگی کی گاندھاری کے سامنے لنگوٹ باندھ کر کھڑا ہوا۔۔تم ان کو بھول جانا۔

تمہارا شبھ چنتک''

(ایضاً۔ص176)

سریندر پرکاش کے یہاں ایسے بہت سے افسانے ہیں جن میں اساطیری بازگشت پائی جاتی ہے۔یہ اساطیر کتنی اہم ہیں اس کا اندازہ ان کے افسانے پڑھ کر لگایا جا سکتا ہے۔سریندر پرکاش کی پیش کش میں ایک منفرد لہجہ کارفرما ہے۔وہ افسانے کے سیدھے سادے پلاٹ سے گہری معنویت آمیز باتیں کہہ جاتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانے ہلکے پھلکے سے غور وفکر سے سمجھے جا سکتے ہیں سوائے کچھ افسانوں کے کہ جن کے پلاٹ اور اس میں پیش کی گئی باتیں تھوڑی پیچیدہ ہیں۔1960 کے نئے افسانے جہاں اپنے نئے قالب میں ہونے کی وجہ سے بہت سے لوگوں کو چیستاں نظر آتے ہیں وہیں ان کی معنویت اور ان میں مسائل کی عکاسی سے منھ بھی نہیں موڑا جا سکتا، نئے افسانے پر جتنی تنقید ہوئی اس تنقید نے اس کے خدوخال کو اور واضح کیا، سمجھنے کی نئی جہتیں ہموار ہوئیں اور ان افسانوں کی اہمیت اجاگر ہوئی۔یہی وجہ ہے کہ ترقی پسندوں نے بھی علامتی اور تجریدی افسانے لکھے۔سریندر پرکاش کے یہاں گہرائی اور گیرائی دونوں ملتی ہیں۔انھوں نے زندگی کی صعوبتوں کو افسانوں میں جذب کر دیا۔جس طرح ان کے یہاں شعوری کاوشیں ہیں اسی طرح وہ لاشعوری کیفیات بھی ہیں جن کا ذکر وہ اپنے افسانوں میں اکثر علامتی اور اساطیری کرداروں کے ذریعے کرتے ہیں۔ان تمام خصوصیات کی وجہ سے ان کے افسانے ادب میں اپنی منفرد پہچان رکھتے ہیں۔ ☆☆

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی





شمس الرحمٰن فاروقی کی یاد میں

2020 میں ماہ دسمبر کی 25/تاریخ کو آبروئے اردو شمس الرحمٰن فاروقی نے وفات پائی تھی۔ اس حادثۂ فاجعہ پر زائد از ایک سال گزر گیا مگر کوئی دن شاید ہی ایسا گزرا ہو کہ کسی نہ کسی نوع سے ان کی یاد نہ آئی ہو اور رنجیدہ نہ کر گئی ہو۔ بلاشبہ یہ دنیائے علم وادب کا ایک بڑا سانحہ تھا۔ یہ صرف ایک ادیب اور نقاد کی موت نہ تھی بلکہ علم وفضل کی موت تھی۔ اردو کے ایک جانباز سپاہی کی موت تھی۔ اردو کے ایک سرپرست اور مربی ومحسن کی موت تھی۔ ایک بڑے مصنف، محقق اور نقاد کی موت تھی۔ یہی سبب ہے کہ ان کے ماتم کا سلسلہ آج بھی رکا نہیں اور شاید برسوں نہ رکے گا۔ ان کی کمی ہر جگہ محسوس ہوگی۔ یہ ایک ایسا خلا ہے جو شاید کبھی نہ پر ہو سکے۔ اردو کی زمین اگرچہ ابھی بنجر نہیں ہوئی ہے۔ ہمیشہ لعل وگہر پیدا ہوتے رہیں گے، مگر اب دوسرا فاروقی پیدا نہیں ہوگا۔

فاروقی صاحب کے علم وفضل سے ہند وپاک کا ہر صاحب علم واقف ہے۔ ان کی یادیں تازہ کرنے کے لئے ان کی لافانی تصنیفات کافی ہیں جن کا دائرہ متنوع اور گوناگوں ہے۔ مدت العمر قلم ان کے ہاتھ میں رہا اور ایسے لازوال نقوش ثبت کرتا رہا جن کی چمک شاید ہی مرور زمانہ مٹا سکے۔ ان کے فضل وکمال پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور آئندہ بھی لکھا جاتا رہے گا۔ دسیوں کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور بیسیوں لکھی جائیں گی۔ رسائل وجرائد کے فاروقی نمبر کے علاوہ اطہر فاروقی کی کتاب ''ارمغان فاروقی'' اور ڈاکٹر رضا حیدر کی مرتبہ کتاب ''شمس الرحمٰن فاروقی: ادیب و دانش ور'' فاروقی صاحب کی شخصیت پر عمدہ تحریروں کے مجموعے ہیں اور فاروقی صاحب کو سمجھنے میں ان سے کافی مدد ملے گی۔ فاروقی صاحب اور ان کی کتابوں پر مضامین اور تبصرے تو کثرت سے لکھے گئے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ شاید ہی اردو کے کسی ادیب ودانشور کے بارے میں اس کی زندگی میں اتنا لکھا گیا ہو جتنا کہ فاروقی صاحب کے بارے میں لکھا گیا ہے۔ میں اپنی اس تحریر کو ذاتی حدود تک محدود رکھنا چاہتا ہوں تاکہ اسے سمیٹ کر اپنی رنجیدگی کم کر سکوں اور ان کی شفقتوں کو دکھا سکوں۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ان کے کارناموں کے بیان کے لئے ایک دفتر درکار ہوگا۔

فاروقی صاحب اسی خطۂ اعظم گڑھ جس پر فیضان تجلی ہے یکسر سے اٹھے تھے اور واقعی آسمان علم وادب پر نیر اعظم بن کر چمکے۔ وہ جہاں گئے اور جس محفل میں بیٹھے بزم کی آبرو اور شان رہے۔ ادبیات کی کسی محفل میں رہے جان محفل رہے۔ گویا ہوئے تو ارباب کمال ان کی گویائی پر مرمٹے۔ جس موضوع پر قلم اٹھایا ایک نقش قائم کیا۔

کوئر یا پار سے وہ اعظم گڑھ آئے۔ شبلی نیشنل اسکول اعظم گڑھ کے طالب علم رہے۔ پھر میاں جی اسلامیہ کالج گورکھپور سے تعلیم حاصل کی۔ میری پیدائش سے پہلے وہ شبلی نیشنل کالج میں انگریزی ادبیات کے استاذ منتخب ہوئے۔ خوب پڑھا اور پڑھایا۔ اسی زمانہ میں معیار میرٹھ میں بعض انگریزی نظموں کے ترجمے شائع ہوئے۔ لکھنے کا آغاز تو انہوں نے کم عمری اور میاں جی اسلامیہ کالج گورکھپور کی طالب علمی میں کر دیا تھا۔ مگر معیار میں جو تراجم اور تخلیقات شائع ہوئیں ان سے ان کے معاصرین متاثر ہوئے۔ کئی برس ہوئے ناچیز نے معیار میرٹھ کی بعض تخلیقات کا عکس فاروقی صاحب کو بھیجا تو انہوں نے لکھا:

> ''مجھے یاد نہیں لیکن زبان میری ہی لگتی ہے۔ آڈن کی نظم کا ترجمہ کرنا ضرور یاد ہے۔ میں نے کچھ محفوظ نہیں کیا۔ نام بھی ابھی متعین نہیں کیا تھا۔ چلئے آپ دوستوں نے دیکھ لیا، یہی بہت ہے۔'' (25/اپریل 2020)

فاروقی صاحب جس زمانہ میں شبلی کالج میں استاد تھے کالج کے ارباب حل وعقد نے علامہ شبلی کی یاد میں ایک ہفتہ منانے کا منصوبہ بنایا اور بہت بڑے پروگرام کا منصوبہ بنا جس میں اردو، ہندی اور انگریزی کے ادیبوں کو شرکت کی دعوت دی گئی اور ایک ہفتہ تک علامہ شبلی کی شخصیت اور فکر وفن پر متعدد مجالس کا انعقاد ہوا، جس میں تقریریں ہوئیں اور مقالات پیش کئے گئے۔ اس میں ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی علی گڑھ سے اور پروفیسر شبیہ الحسن نونہروی لکھنؤ سے تشریف لائے تھے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی نے اپنا مقالہ شبلی کا تنقیدی مسلک اسی تقریب میں پڑھا تھا۔ فاروقی صاحب بھی ان مجالس میں شریک رہے اور علامہ شبلی کی تنقید نگاری پر مقالہ پیش کیا۔ وہ مقالہ میں نے بہت تلاش کیا مگر دستیاب نہیں ہوا۔ اس کی بابت فاروقی صاحب سے دریافت کیا مگر وہ یہ کہہ کر ٹال گئے کہ پتہ نہیں اب کچھ یاد نہیں۔

شبلی کالج ہی کے زمانۂ قیام میں وہ IAS کے امتحان میں بیٹھے اور منتخب ہوئے۔ کالج کی تاریخ میں یہ ایک نمایاں اور پہلا واقعہ تھا۔ یہاں سے جب وہ مستعفی ہوئے اور اپنی ملازمت پر جانے لگے تو طلبہ واساتذہ نے ایک الوداعی تقریب منعقد کی۔ جس میں IAS منتخب ہونے پر جہاں تہنیت پیش کی گئی وہیں کالج سے سبکدوش ہونے پر رنجیدہ بھی ہوئے۔ اس تقریب میں ماسٹر محمد مسلم صاحب مرحوم نے اپنے والد امین اللہ امین اعظمی کی لکھی ہوئی الوداعیہ نظم پیش کی تھی جو ان کے مجموعہ ''سرمایہ امین'' میں شامل ہے۔ وہ نظم یہ ہے:

وداعِ فاروقی :

مبارک شمس رحماں! آپ کو یہ فضل ربانی — مبارک ہو مبارک طالعِ قسمت کی تابانی
مبارک ہو ترقی، خوش نصیبی، اوجِ سامانی — مبارک ہو نشاط انگیز جلووں کی فراوانی
نظر روشن ہے دل روشن، جہانِ آرزو روشن — چمک اٹھا ہے یوں نجمِ سعادت، نورِ پیشانی
یہ عہدہ اور یہ منصب اگرچہ کم نہیں لیکن — حقیقت یہ ہے کب اہلِ نظر نے قدر جانی
زہے تقدیر وہ جوہر ملا ہے علم و دانش کا — بنے گی مشعلِ راہِ ترقی اس کی رخشانی
بجز فرقِ مراتب، سب سے یکساں طور پر ملنا — نہ کیوں ہو ذات فاروقی پہ نازاں خلق انسانی

رفیق اعزازی دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ
فون:9838573645 azmi408@gmail.com

گھرانا آپ کا مشہور ہے خلق و مروت میں
اسی نورِ شرافت کی ہے ساری پرتو افشانی

دبستاں چھوڑ کر ایسا شفیق استاد جاتا ہے
پریشاں جس کی فرقت سے ہے ہر طفلِ دبستانی

بچشم اشکبار آئے ہیں ہم یہ معذرت لے کر
خدا بخش دیں جو کچھ ہوئی ہو ہم سے نادانی

خدا کا خوف اور حسنِ عمل پر ہے نظر لازم
اسی سے طے کریں گے آپ ہر منزل بہ آسانی

ستارہ اوج پر ہو آپ کے بامِ ترقی کا
ہمیشہ آپ پر ہو سایہ افگن ظلِ سبحانی

عجب عالم ہے اپنا کچھ کہا جاتا نہیں مسلّم
ترقی کی مسرت ہے ، جدائی کی پریشانی

(5 ستمبر 1958)

'سرمایہ امین' کی اشاعت کے بعد یہ نظم میں نے فاروقی صاحب کو بھیجی تو انہوں نے لکھا کہ ''نظم کے لئے شکریہ۔ بھولا بسرا وقت یاد آ گیا۔ آپ کو کہاں سے ملی؟''

ان کے شبلی کالج کے زمانۂ ملازمت میں پروفیسر ملک زادہ منظور احمد (1929-2016) بھی شبلی کالج میں انگریزی ادب کے استاد تھے۔ انہوں نے اپنی خودنوشت ''رقص شرر'' میں اس دور کا ذکر کسی قدر تفصیل سے کیا ہے۔

ناچیز ان کی شفقتوں کے سایہ میں کب آیا؟ کچھ صحیح یاد نہیں۔ یہ شاید 1990 کے بعد کا واقعہ ہے کسی رسالہ میں میرا مضمون شائع ہوا تو فاروقی صاحب نے فون سے داد دی اور میرا حوصلہ بڑھایا۔ اس کے بعد فاروقی صاحب کبھی کبھی فون کر کے مضامین اور کتابوں پر حوصلہ افزائی کرتے یا اعظم گڑھ کا احوال دریافت کرتے۔ جس دن ان کا فون آتا میں پھولے نہ سماتا اور احباب سے ان کا ذکر نہایت ادب و احترام سے بلکہ فخریہ کرتا۔ اس سے نفس کو جو تقویت ملتی تھی وہ اپنی جگہ البتہ احباب میں اہمیت اور بڑھ جاتی۔ ایک دفعہ فاروقی صاحب کا فون آیا تو میں نے بے خیالی میں جی ڈاکٹر صاحب کہہ دیا۔ کہنے لگے ''ابے میں کب سے ڈاکٹر ہو گیا۔'' میں نے کہا آپ ڈاکٹر ہیں بس کسی دن ڈاکٹریٹ کی سند کوئی یونیورسٹی دے دے گی۔ اتفاق ایسا ہوا کہ اس کے دوسرے ہی دن کسی یونیورسٹی نے انہیں ڈاکٹریٹ کی سند دینے کا اعلان کیا تو میں نے انہیں مبارک باد دی۔ ایک دن پہلے کی گفتگو انہیں یاد آئی تو کہنے لگے ''ابے تو نجومی کب سے ہو گیا؟''

2002 میں میری تھیسس ''دارالمصنّفین کی تاریخی خدمات'' خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ سے شائع ہوئی اور اسے فاروقی صاحب کی خدمت میں بھیجا تو انہوں نے پوسٹ کارڈ لکھا:

برادرم ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی السلام علیکم

آپ کی کتاب ''دارالمصنّفین کی تاریخی خدمات'' نہایت دلچسپ ہے اور سب سے عمدہ بات یہ ہے کہ آپ نے محدود موضوع کو اس طرح برتا ہے کہ اس میں وسعت پیدا ہو گئی ہے۔ آپ کا انداز گفتگو بھی سادہ اور دل نشیں ہے۔ اس کتاب کو حوالے کے طور پر استعمال کیا جائے گا۔

آپ کا
شمس الرحمٰن فاروقی
2 ستمبر 2004

فاروقی صاحب کی یہ پیشین گوئی درست ثابت ہوئی اور میرا یہ مقالہ حوالہ کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے۔ اس موضوع پر کئی کتابیں شائع ہوئی ہیں ان میں پروفیسر خورشید نعمانی صاحب کی کتاب ''دارالمصنّفین کی تاریخی اور علمی خدمات'' بے حد وقیع کتاب ہے اور دارالمصنّفین سے شائع ہوئی ہے، تاہم یہ سچ ہے کہ اس موضوع پر لکھتے ہوئے میرے مقالے کا حوالہ دیا جاتا ہے۔

اس کے بعد 2005 میں میرے ناچیز مضامین کا مجموعہ ''عظمت کے نشاں'' شائع ہوا اور ان کی خدمت میں پہنچا تو انہوں نے قدرے مفصل خط لکھا جس سے مجھے بڑی رہنمائی ملی۔ وہ خط درج ذیل ہے:

برادرم ڈاکٹر الیاس الاعظمی السلام علیکم

آپ کی کتاب ''عظمت کے نشاں'' میں نے بہت دلچسپی سے پڑھی۔ آپ کے اسلوب نگارش کی خوبی اس بات سے ثابت ہے کہ میں پوری کتاب ایک نشست میں پڑھ گیا اور مجھے کسی قسم کی گرانی کا احساس نہ ہوا۔ آپ کے وفیاتی مضامین تو عموماً ٹھیک ہیں لیکن ان کا کوئی جوڑ بقیہ کتاب سے نہیں ہے، اس لئے انہیں کسی اور مجموعے کے لئے اٹھا رکھنا تھا۔ کئی مضامین تو معلومات کا خزانہ ہیں اور میں ان کے لئے آپ کا ممنون رہوں گا۔ آپ نے معلومات کو پیش کر دیا ہے لیکن تجزیہ اور تعبیر سے گریز کیا ہے۔ لہٰذا ان تحریروں کی معلوماتی قدر تو مستحکم ہے، لیکن علمی اعتبار سے یہ ہمیں بہت دور نہیں لے جاتے۔ علامہ شبلی، سرسید، مولانا ابوالکلام، ان صاحبان کے ذکر میں تجزیہ اور تعبیر کی بہت گنجائش تھی۔ بہرحال ہر کتاب کا اپنا مقصد ہوتا ہے۔

مجھے یہ پڑھ کر بہت خوشی ہوئی کہ آپ نے عربی زبان اپنی محنت سے کسی مکتب یا کالج میں تلمیذ ہوئے بغیر حاصل کی۔ مبارک ہو۔

ایں کار از تو آید۔

آپ کی کتاب میں کتابت کی غلطیاں بہت کھٹکتی ہیں۔ کچھ تو کاتب کی لاپروائی کے سبب ہیں لیکن ایک ایسی ہے جس میں آپ کی بھی لاپروائی شاید شامل ہے۔ یعنی آپ نے (اور مقتدر معاصر 'معارف' نے بھی) ہمزہ کو تقریباً دیس نکالا دے دیا ہے۔ لطف یہ کہ جہاں ہمزہ اردو کے قاعدے سے غلط ہے وہاں ہمزہ ضرور دیا گیا ہے۔ خیر اس سے معنیٰ میں کچھ خلل نہیں پڑتا، لیکن ذرا مندرجہ ذیل کو ملاحظہ کریں:

مجموعہ نظم شبلی: سفرنامہ روم و مصر و شام (ص42) ہدیہ سلیمانی: سرمہ سلیمانی (ص64) فلسفہ جدیدہ (ص76) تلامذہ شبلی (ص83)۔ میں نے مولانا ضیاء الدین صاحب کو 'معارف' میں اس طرح کے فک ہمزہ کی طرف متوجہ کیا لیکن ان پر خدا معلوم کیوں کچھ اثر نہ ہوا۔

مندرجہ بالا تمام تراکیب میں ہمزۂ اضافت غائب ہے۔ لطف یہ کہ ص83 پر 'انشاء پرداز' لکھا ہے، حالانکہ یہ کوئی لفظ ہی نہیں۔ الف کے آگے ہمزہ لگانے کے شوق نے لفظ کی شکل بگاڑ دی۔ اسی طرح جگہ جگہ ''معرکہ آراء'' لکھا ہے۔ (مثلاً ص48)۔

یہ محض دوستانہ استدراکات ہیں، تنقیص نہیں۔

آپ کا نیازمند
شمس الرحمٰن فاروقی
2 ستمبر 2006

اس عالمانہ اور تصحیحاتی خط سے میں نے بہت کچھ سیکھا اور خاص طور پر زبان و بیان درست کی اور حتی الامکان اس طرح کے اغلاط سے بچنے کی کوشش کرنے لگا۔ لکھتے وقت اکثر خیال آ جاتا کہ اگر یہ تحریر فاروقی صاحب کی نظر سے گزری تو وہ ضرور گرفت کریں گے۔ افسوس ایسا شفیق مربی نہیں رہا۔

'عظمت کے نشاں' کے بعد کئی برس خاموشی رہی۔ اس دوران ناچیز کی کئی کتابیں منظر عام پر آئیں اور ان کی خدمت میں بھیجیں مگر وہ خاموش رہے۔ غالباً وہ ان کی نظر سے نہیں گزریں یا قابل اعتنا نہ ٹھہریں۔

2011 میں 'کتابیات شبلی' دارالمصنّفین نے شائع کی تو انہوں نے میری محنت کو سراہا۔ اس کا ذکر خبر نامہ شب خون میں کیا۔ فون سے بھی حوصلہ افزائی کی۔ بلاشبہ کتابیات شبلی کی ترتیب و تدوین میں ناچیز نے رات دن ایک کر دیا تھا اور اس میں علامہ شبلی سے متعلق بے شمار معلومات یکجا کی ہیں۔

2012 میں ناچیز نے علامہ شبلی کے منتشر مکاتیب کا مجموعہ 'مکتوبات شبلی' مرتب کیا۔ اس کے طبع اول میں 210 خطوط شامل تھے۔ یہ میرا پہلا تدوینی کام تھا، اس میں تلاش و جستجو سے جو کام لیا گیا ہے وہ اپنی جگہ، اصل کام تحقیق متن کا تھا۔ ناچیز نے اس میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا تھا، تاہم سہما ہوا تھا کہ خدا جانے محققین کا کیا رویہ ہو۔ متعدد اہل علم کی خدمت میں مکتوبات شبلی

پیش کی۔ ڈرتے ڈرتے فاروقی صاحب کی خدمت میں بھی بھیجی۔ انہوں نے کئی ماہ بعد ایک مفصل خط لکھا اور تعریف وتحسین کے ساتھ اس کی ایک ایک کمیاں دکھائیں۔ اس سے میرا حوصلہ نہیں ٹوٹا بلکہ جس شفقت ومروت سے انہوں نے اغلاط کی نشاندہی کی تھی اس سے حوصلہ افزائی ہوئی۔ اور عزم وہمت میں مزید اضافہ ہوا۔ وہ مفصل خط اس لائق ہے کہ ترتیب وتدوین کا کام کرنے والے ہر شخص کو ایک بار ضرور پڑھنا چاہئے۔ اس لئے طوالت کے باوجود یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

برادرم الیاس الاعظمی السلام علیکم

کچھ دن پہلے آپ کی کتاب 'مکتوبات شبلی' ملی تھی، بہت خوشی ہوئی۔ شکریہ۔ آپ اس زمانے کے چند لوگوں میں سے ہیں جو دل لگا کر کام کرتے ہیں۔ علامہ مرحوم کے ان خطوط کی تدوین بھی آپ کے اچھے کاموں میں گنی جائے گی۔ یہ ضرور ہے کہ اس کام میں بہتری کی مزید گنجائش ہے۔ ایک تو یہ کہ عربی عبارتیں جو جگہ جگہ خطوط میں آئی ہیں ان کا ترجمہ دینا چاہئے تھا۔ دوسری بات یہ کہ آپ نے جگہ جگہ مفصل حاشیے لکھے ہیں خاص کر رجال پر آپ نے بہت محنت کی ہے۔ لیکن کئی مقام ایسے آئے ہیں جہاں علامہ کے خط کے بین السطور پر بھی آپ کو کلام کرنا چاہئے تھا۔ مثلاً یہ کہ حضرت مولانا محمد علی مونگیری کے نام پہلے ہی خط میں یہ اشارہ ملتا ہے کہ علامہ اور مولانا مونگیری کے درمیان کچھ چھوٹی موٹی غلط فہمیاں یا آپسی شکایتیں بھی تھیں۔ چنانچہ مولانا مونگیری کے پہلے خط کا کچھ پس منظر آپ کو پہلے بیان کرنا چاہئے تھا۔ پھر یہ کہ ایک طرف تو آپ نے امام بخاری پر تقریباً پورا صفحہ لکھا اور دوسری طرف امام مسلم کے بارے میں جن کی صحیح کا حوالہ علامہ کے خط میں ہے ان پر آپ نے کوئی تفصیل نہیں لکھی۔ مولوی بشیر الدین کے نام خط میں صفحہ 46 پر جو جملہ ہے ''ندوہ کی ہمدردی پر بعض حامیان کالج مجھ کو رقیبانہ نگاہ سے دیکھتے ہیں۔'' اسی صفحے پر علامہ نے صاف صاف شکایتیں مولوی بشیر الدین کے طرز عمل کے خلاف کی ہیں لیکن آپ نے ان عبارتوں پر کوئی بھی توجہ نہیں کی۔ صفحہ 87 پر علامہ نے لکھا ہے کہ ''آج کل پروفیسری کے لئے معقول تنخواہ پر بلایا ہے۔'' یہ اشارہ غالباً علی گڑھ کی طرف ہے۔ آپ نے اس پر کوئی تفصیل نہیں لکھی۔ اسی صفحے پر آپ نے ''اہل خانہ'' پر حاشیہ نمبر 13 لگایا ہے اسے 14 ہونا چاہئے تھا۔ اسی صفحے پر علامہ کے پاؤں کے حادثے کا ذکر ہے۔ مگر آپ نے اس پر کوئی نوٹ نہیں لگایا۔ صفحہ 101 پر علامہ نے ''انجمن'' کو مذکر لکھا ہے، یہ صراحت ضروری تھی کہ اصل میں یوں ہی ہے۔ یعنی علامہ ''انجمن'' کو مذکر لکھتے تھے۔ اسماء رجال پر اتنی محنت کرنے کے باوجود آپ نے مولوی حمید الدین (صفحہ 109) پر کوئی نوٹ نہیں دیا۔ اسی طرح عبدالحی کو 108 صفحہ پر مع ہمزہ لکھا ہے۔ امید ہے یہ کتابت کی غلطی ہوگی۔ کیونکہ آپ کے حاشیے میں بھی (صفحہ 110 اور صفحہ 152) یوں ہی ہے۔ گمان گزر سکتا ہے کہ علامہ سے سہو قلم ہو گیا ہوگا۔ کتابت کی ایسی غلطی افسوس ناک ہے۔ اس صفحے پر مولانا عبدالحی کے نام جو خط ہے اس کو بھی حاشیے کی ضرورت تھی۔

صفحہ 141 پر نواب سید علی حسن خاں کے خط میں علامہ لکھتے ہیں ''آپ حضرت عمرؓ کی طرح دریا سے ڈرتے ہیں۔'' اس پر آپ نے کوئی حاشیہ نہیں دیا۔ مجھے بالکل نہیں معلوم کہ حضرت عمرؓ کے بارے میں اس اطلاع کا ماخذ کیا ہے۔

مولانا عبدالباری کے نام جو خط صفحہ 162 پر ہے اس پر آپ کی طرف سے حاشیہ بہت ضروری تھا۔ اس خط کی تاریخی اور سوانحی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ (بر سبیل تذکرہ، اس صفحے پر بھی عبدالحی جہاں جہاں لکھا ہے مع ہمزہ لکھا ہے۔)

صفحہ 171 پر نظام المشائخ مع تحتانی لکھا ہے یہ آپ کا املا ہے یا علامہ کا؟ اسی خط میں یہ جملہ بالکل سمجھ میں نہیں آیا ''کیا آپ کچھ فیض انگیز یاد دلائیں گے۔''

صفحہ 191 پر عربی عبارت حسب معمول بے ترجمہ ہے اور نسخ کے بجائے نستعلیق میں لکھی ہوئی ہے۔ صفحہ 149 پر عربی کا شعر ہے، بے ترجمہ۔ صفحہ 198 پر 'پڑ گئے' کو 'پڑ گیے' لکھا ہے۔ یہ کس کا املا ہے؟ علامہ کا؟ صفحہ 205 پر عبدالوہاب بہاری پر جو حاشیہ ہے اس میں صرف وہی بات کہہ دی گئی ہے جو علامہ نے اپنے خط میں کہی ہے۔

ان سب باتوں کے باوجود کتاب بہت کارآمد ہے۔ میں آپ کو مبارک باد دیتا ہوں۔ دو چار دن ہوئے آپ کی ایک کتاب اور ملی ہے شکریہ۔ اس کی رسید الگ سے لکھوں گا، انشاءاللہ۔

آپ کا

شمس الرحمٰن فاروقی

6 اپریل 2013

'مکتوبات شبلی' کی اشاعت کے بعد دوسری کتاب ''علامہ شبلی کے نام اہل علم کے خطوط'' شائع ہوئی۔ اس کے مقدمہ میں فارقی صاحب کا یہ خط نقل کر کے میں نے فاروقی صاحب کو یقین دلایا کہ آئندہ تحقیقات اور مکتوبات شبلی کے دوسرے ایڈیشن میں ان کے خیالات کا لحاظ بہرصورت رکھا جائے گا اور اس کتاب میں بڑی حد تک اس کا پاس ولحاظ رکھا گیا ہے۔

''علامہ شبلی کے نام اہل علم کے خطوط'' کا انتساب فاروقی صاحب کے نام ہے۔ اس پر ان کی نظر پڑی تو انہوں نے کہا کہ اس سے مجھے بہت خوشی ہوئی۔

2013 میں ناچیز کی ضخیم کتاب 'آثار شبلی' دارالمصنفین نے شائع کی تو مکتوبات شبلی پر تبصراتی تحریر کے شکریہ کے ساتھ آثار شبلی ان کی خدمت میں بھیجی۔ اس کے جواب میں انہوں نے لکھا کہ

برادرم محمد الیاس الاعظمی السلام علیکم

آپ کے خط کا مجھے انتظار تھا کیونکہ میں نے بڑی محنت سے آپ کی کتاب پر اظہار خیال کیا تھا۔ ڈر تھا کہ کہیں ای میل پہنچی ہی نہ ہو۔ آج کل یہ سب بھی ہونے لگا ہے۔ اب آپ کی ای میل سے طبیعت کو اطمینان ہوا اور اس بات پر خوشی ہوئی کہ آپ نے میری معروضات کو قابل لحاظ جانا۔

'آثار شبلی' مجھے کچھ دن ہوئے مل گئی تھی، مگر میں نے جواب اس لئے نہیں لکھا کہ یقین نہیں تھا کہ میری پچھلی ای میل آپ کو ملی کہ نہیں۔ ''آثار شبلی'' میں نے کم وبیش پوری پڑھ ڈالی۔ ایک آدھ لوگوں سے ذکر بھی آیا تو میں نے کہا کہ کتاب کیا ہے، شبلی پر معتبر اور محققانہ معلومات کا خزانہ ہے۔ آپ کا طرز تحریر مجھے ہمیشہ شگفتہ اور واضح معلوم ہوا، جو بڑی بات ہے۔ شبلی کے مخالفین پر بھی آپ نے جگہ جگہ بہت متانت اور دیانت سے اظہار خیال کیا ہے۔

آپ کی کتاب چونکہ شبلی کے سوانح حیات پر مشتمل ہے، اس لئے اس میں علمی مباحث کی گنجائش زیادہ نہ تھی۔ لیکن بہتر تھا کہ بعض معاملات پر کچھ زیادہ بحث کی جاتی۔ مثلاً حافظ محمود شیرانی صاحب کے اعتراضات، مولانا اسلم جیراج پوری کے اعتراضات اور ہمارے زمانے میں ظفر احمد صدیقی صاحب کی بعض رائیں (خاص کر شبلی کی سیرت نگاری اور علم حدیث کے بارے میں) ان کا کچھ اور ذکر ہونا چاہئے تھا۔ یہ تو بالکل درست ہے کہ اسلم جیراج پوری کی کیا ہستی ہے۔ حافظ صاحب نے بھی لکھا ہے، اس سے ''شعر العجم'' کی قدر وقیمت میں کوئی کمی نہیں آتی۔ لیکن پھر بھی آپ کو تھوڑی سی مزید بحث کرنا ضروری تھی۔ خاص کر شبلی کے نظریۂ شعر اور نظریۂ تاریخ کے بارے میں آپ کو کچھ کلام کرنا تھا۔ سرسید نے 'الفاروق' کے منصوبے پر کوئی خاص جوش ظاہر نہیں کیا تھا۔ اس پر اور بعض دوسرے سید صاحبان کی شکایات پر بھی تھوڑی سی بحث کرتے تو خوب تھا۔

بعض باتیں بالکل نظر انداز ہو گئی ہیں۔ شاید مصلحت کا تقاضا تھا۔ لیکن حقیقی اور ایماندار سوانح نگار مصلحت کے اوپر بھی کچھ چیزوں کو اہمیت دیتا ہے۔ شبلی کی بیماریاں جو تقریباً اوائل عمر سے آخر تک رہیں، شبلی کی ازدواجی زندگی، شبلی کے حلقۂ احباب اور ان کا آپس میں ایک دوسرے پر اثر، خود شبلی کی پسند اور ناپسند، خاص کر لباس اور کھانے کے معاملے میں۔ موسیقی اور نغمے اور عوامی کھیل کود، میلوں، تقریبوں وغیرہ میں شبلی کی دلچسپی پر آپ نے کچھ نہیں کہا۔ ندوے میں پہلی

اسٹرائک کا کوئی ذکر نہیں، جس میں شاید مولانا عبدالسلام ندوی بھی شریک تھے۔ شبلی کے سیاسی خیالات اور کانگریس سے ان کی ہم خیالی اور وابستگی اس پر بھی آپ نے بہت سرسری گفتگو کی ہے۔ دوسرے الفاظ میں مولانا سید سلیمان ندوی صاحب کی ''حیات شبلی'' میں جو کمیاں ہیں وہ کم وبیش یہاں بھی نظر آتی ہیں۔ بس یہ ہے کہ آپ مولانا سید سلیمان ندوی صاحب کے بہت بعد میں ہیں لہٰذا آپ کی دست رس ان کاغذات اور واقعات تک ہے جو مولانا مرحوم کی دسترس سے باہر تھے۔

بھائی صاحب آپ نے مجھ پر بڑا کرم کیا جو شبلی کے نام مشاہیر کے خطوط کا مسودہ اشاعت کے پہلے مجھے دکھانا چاہتے ہیں۔ حاشا وکلا میری یہ حیثیت اور لیاقت نہیں۔ علاوہ بریں نہ عمر، نہ صحت، نہ فرصت۔ یہ سب چیزیں اب اوراق پارینہ ہوکر رہ گئی ہیں۔ خود اپنے اوپر کچھ کام میں نے لگا رکھے ہیں یا لے لئے ہیں جو بہت دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہے ہیں بلکہ آہستہ خرام سے مخرام کی منزل میں آگئے ہیں۔

میں آپ کی لیاقت اور بالخصوص علامہ شبلی سے آپ کی لگن اور علمی دلچسپی کا قائل ہوں۔ لیکن افسوس ہے کہ اب میں کوئی ایسا کام قبول نہیں کرسکتا جس کے لئے میں خود کو صلاحیت اور فرصت دونوں سے عاری پاتا ہوں۔

حضرت عمرؓ اور پانی والے معاملے کے لئے 'الفاروق' ایک بار پھر دیکھوں گا۔ یقین ہے کہ کہیں نہ کہیں نظر پڑ جائے گی اور تفصیلات معلوم ہوجائیں گی۔

'معارف' کا معاملہ یہ ہے کہ آپ کو معلوم ہی ہے کہ وہاں شبلی کے بارے میں ایک طبقہ کسی بھی تازہ خیالی یا مقررہ راستے سے ہٹ کر دیکھنے والوں کو ناپسند کرتا ہے۔ مجھے ''معارف'' کی مجلس ادارت کی رکنیت باعث اعزاز تو تھی لیکن ایسے اعزاز سے کیا فائدہ جس سے کوفت پیدا ہو اور لوگوں کو گمان گزرے کہ فاروقی صاحب کو یہ رکنیت کتنی عزیز ہے کہ بے حیائی کر کے بھی اسے گلے سے لگائے بیٹھے ہیں۔ مانا کہ اس زمانے میں بعض ایسے بڑے ادیب موجود ہیں جو ذلت کھاتے ہیں اور پھر بھی محفل میں جلوہ افروز رہتے ہیں۔ یہ مجھ سے کبھی نہ ہوا تو اب کیا ہوگا، جب سفینہ کنارے پر آلگا ہے۔ آپ کی محبت کے لئے شکر گزار ہوں۔

آپ کا
شمس الرحمٰن فاروقی
25 اپریل 2013

یہ خط اہم ہے۔ اس سے ان کی علامہ شبلی پر گہری اور عالمانہ نظر کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ خط کے آخر میں معارف کے ایک معاملہ کا ذکر ہے۔ وہ معاملہ یہ ہے کہ دارالمصنّفین کے اس وقت کے ڈائرکٹر پروفیسر اشتیاق احمد ظلی صاحب نے فاروقی صاحب کو ماہنامہ معارف کی مجلس ادارت کا رکن نامزد کیا جسے انہوں نے قبول کرلیا، چند ماہ بعد مرحوم پروفیسر سید عبدالباری شبنم سبحانی (1937-2013) نے ان کے خلاف معارف میں ایک مراسلہ لکھا جو معارف میں شائع کردیا گیا، فاروقی صاحب نے اس سے دل برداشتہ ہوکر مجلس ادارت کی رکنیت سے استعفیٰ دے دیا اور تمام تر کوششوں کے باوجود مجلس ادارت کی رکنیت کے لئے راضی نہیں ہوئے۔

دارالمصنّفین کے تعلق سے ایک اور بات یاد آگئی۔ ایک سال انہیں توسیعی خطبے کے لئے مدعو کیا گیا۔ چنانچہ وہ تشریف لائے اور ''شبلی کی فارسی غزل'' کے موضوع پر خطبہ دیا۔ اس موقع پر پروفیسر اشتیاق احمد ظلی صاحب نے موجود مہمانوں کا ان سے تعارف کرایا اور جب میرا تعارف کرانا چاہا تو انہوں نے کہا کہ یہ تو میرا پرانا دوست ہے۔ میرے لئے یہ بڑی بات تھی آج بھی وہ منظر میری آنکھوں میں ہے۔ اللہ انہیں غریق رحمت کرے۔ ظلی صاحب کو ان سے میرے دیرینہ تعلق کا شاید علم نہیں تھا۔

ان کا توسیعی خطبہ علی العموم پسند نہیں کیا گیا۔ ہوا یہ کہ جب انہوں نے خطبہ شروع کیا تو دارالمصنّفین کی انتظامیہ کے ایک رکن نے ان سے فرمائش کی کہ فارسی اشعار کی تشریح بھی کرتے جائیں۔ علامہ شبلی کی فارسی غزلیں غزلیں کاہے کو ہیں وہ تو بقول مولانا حالی شراب دوآتشہ ہیں۔ چنانچہ ان کی تشریح بھی اسی لحاظ سے فاروقی صاحب نے کی، لیکن اعظم گڑھ میں علامہ شبلی کو ایک عالم اور سیرت نگار کی حیثیت سے جو تقدس حاصل ہے، غزل کی تشریحات اس سے میل نہیں کھا رہی تھیں اس لئے وہ مقالہ لوگوں کو ناگوار گزرا، لیکن وہی مقالہ جب بغیر اشعار کی تشریح کے سہ ماہی اردو ادب دہلی میں شائع ہوا تو کچھ بھی معیوب نہ تھا۔

فاروقی صاحب میں بڑا استقلال تھا۔ وہ انگریزی ادب کے طالب علم تھے مگر اردو سے وابستہ ہوئے تو پھر مدت العمر کسی اور طرف نہیں دیکھا اور مدت العمر اردو ادب ہی کے رہے۔ اسی طرح ماہنامہ شب خون جاری کیا تو اسے چالیس برس تک شائع کرتے رہے اور بند کرنا ہوا تو اعلان کر کے بند کیا۔ اس موقع پر شب خون کا انتخاب نمبر بھی شائع کیا۔ ایک صاحب نے اس کا اشاریہ بھی بنایا ہے جو شائع ہو چکا ہے۔ کچھ دن خبرنامہ شب خون چھپتا رہا پھر پیرانہ سالی نے فاروقی صاحب کو اسے بھی بند کرنے پر مجبور کردیا۔ اب وہ اپنے ادھورے کاموں کی تکمیل میں جی جان سے لگے اور کئی کاموں کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ اسی دور میں ان کا لاثانی شاہ کار ''کئی چاند تھے سر آسماں'' بھی منظر عام پر آیا۔ میں نے اس کی تحسین وستائش کی تو انہوں نے بالکل سچی بات کہی کہ تمہیں میری کون سی چیز ناپسند آئی ہے۔

2018 میں ناچیز کی کتاب ''شبلی خود نوشتوں میں'' تیار ہوئی تو اس کا پیش لفظ لکھنے کے لئے میں نے فاروقی صاحب سے گزارش کی۔ یہ گزارش میل سے نہیں واٹس ایپ سے کی تھی۔ فاروقی صاحب اس وقت آن لائن تھے مگر انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ دوسرے دن بھی کوئی جواب نہیں آیا تو مجھے خیال ہوا کہ شاید مصروفیت بہت ہے اور وہ نہ لکھ سکیں گے۔ لیکن تیسرے دن علی الصباح ان کا فون آگیا اور کہا کہ کل میں گر گیا تھا اور جب تک سنبھلتا کتابیں میرے اوپر آگریں جس سے ہاتھ میں کچھ تکلیف ہوگئی ہے۔ اس لئے اب تمہارے کام میں تاخیر ہوگی۔ میں نے کہا کوئی بات نہیں اللہ آپ کو صحت دے اور سلامت رکھے۔ البتہ مجھے اس بات سے بے حد خوشی ہوئی کہ وہ میرے خط کے جواب کے بجائے سیدھا پیش لفظ لکھ کر بھیجنا چاہ رہے تھے۔ لیکن پھر چار پانچ دن بعد ہی پیش لفظ لکھ کر بھیج دیا اور ایسا شاندار پیش لفظ لکھا کہ آج تک میری کسی کتاب پر شاید ہی کسی اہل قلم نے ایسا پیش لفظ لکھا ہو۔ اس پیش لفظ میں انہوں نے تین باتیں لکھی ہیں۔ پہلی یہ کہ کسی ایک موضوع پر کام کرنے کی کیا شرائط ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

کم ہی لوگ ایسے ہوں گے جنھوں نے کسی ایک مصنف کی زندگی اور تحریروں کے مطالعے کے لئے اپنی عمر وقف کردی ہو اور ان کے مطالعات کا ثمرہ قابل قدر تصنیفات کی صورت میں بھی سامنے آیا ہو۔ اس صورت حال کے پیدا ہونے کے لئے اور شرطوں کے علاوہ یہ شرط بھی ہے کہ جس شخص کو اپنا موضوع بنایا گیا ہو اس کی تحریروں میں اتنا تنوع اور اتنی قوت ہو کہ وہ تا زیست مطالعے اور گہرے مطالعے کی متحمل ہوسکیں۔ پھر یہ بھی ایک شرط ہے کہ جس شخص نے ایسے کام کا بیڑا اٹھایا ہو، وہ خود صلاحیت اور لیاقت رکھتا ہو اور اس کے مزاج میں اتنی استقامت بھی ہو کہ ناسازگار حالات میں بھی اس کی لگن کم نہ ہو۔

دوسری بات یہ لکھی کہ ہماری علمی تاریخ میں علامہ شبلی نعمانی کا مقام ومرتبہ کیا ہے۔ اس کی انہوں نے ایسی تصریح کی ہے کہ گزشتہ صدی میں اس کی مثال نہیں ملے گی۔ مولانا سید سلیمان ندوی (1884-1953) نے اپنے استاذ علامہ شبلی کو رازی وغزالی اور ابن تیمیہؒ سے تشبیہ دی ہے مگر فاروقی صاحب فرماتے ہیں:

حجت الاسلام علامہ شبلی نعمانی نے بہت کم عمر پائی۔ ان کا زمانہ تصنیف وتالیف وتدریس بھی نسبتاً بہت مختصر تھا، لیکن بلا خوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ صرف تصنیفات ہی کا جائزہ لیں تو

معلوم ہوگا کہ موضوعات کے تنوع، مطالعے کی وسعت، تفکر کی گہرائی اور گیرائی اور استحضار علم کے اعتبار سے ان کا ثانی مسلمانوں میں علم کی بہار کے زمانے میں البیرونی، بوعلی، غزالی جیسوں میں تو مل سکتا ہے، لیکن شبلی کے اپنے زمانے سے لے کر آج تک شبلی کا ثانی تو کیا ایسا بھی کوئی نہ ہوا جسے ہم شبلی کا ظل کہہ سکیں۔

فاروقی صاحب کی اس تحریر سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان کی نظر میں علامہ شبلی کا مرتبہ کس قدر بلند تھا۔ اس کے بعد انہوں نے میری اور میری کتاب کی انفرادیت کا بڑے محبت آمیز انداز میں ذکر کیا ہے اور لکھا ہے:

شبلی پر بہت لکھا گیا ہے، لیکن سوانح کے نقطۂ نظر سے اور علمی مباحث کے نقطۂ نظر سے بھی بہت چھان بین ابھی باقی ہے۔ ہمارے دوست محمد الیاس الاعظمی نے پوری زندگی مطالعۂ شبلی میں گزار دی ہے۔ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ اب شبلی اور الیاس الاعظمی لازم وملزوم ہو گئے ہیں۔ الیاس الاعظمی نے اب تک شبلی پر بارہ کتابیں لکھی یا مرتب کی ہیں، اور ہر ایک میں شبلی کی علمی یا سوانحی زندگی کو کسی نئے نقطۂ نظر سے دیکھا اور پیش کیا گیا ہے۔ ان میں 'شبلی شناسی کے سو سال'، 'شبلی اور جہان شبلی'، 'نوادرات شبلی' اور 'متعلقات شبلی' کو خاص دلچسپی سے دیکھا گیا ہے۔ اب الیاس الاعظمی نے ایک بالکل نیا موضوع دریافت کیا ہے: شبلی کا ذکر خود نوشتوں میں۔ یہ موضوع کچھ ایسا غیر متعین سا ہے کہ اس کا نہ کوئی نقطۂ آغاز ہے اور نہ نقطۂ انجام۔ پھر بھی، الیاس الاعظمی نے کم وبیش چوبیس ایسی خود نوشتیں تلاش کی ہیں جن میں شبلی کا ذکر کسی اہم انداز میں کیا گیا ہے۔ یہ تعداد کم نہیں، بلکہ بڑی حد تک استعجاب انگیز ہے۔ اتنے بہت سے اہم لوگوں نے شبلی کا ذکر اپنی خود نوشت میں کیا، یہ امر بجائے خود شبلی کی عظمت اور اہمیت کو ثابت کرتا ہے۔

محمد الیاس الاعظمی نے حسب معمول دقت نظر سے کام لیا ہے اور شبلی شناسی کا حق ادا کر دیا ہے۔ خدا ان کی کوششوں کو مزید ترقی دے۔ شبلی کو الیاس الاعظمی جیسا جاں نثار زیب بھی دیتا ہے۔ اللہم زد فزد۔

شمس الرحمٰن فاروقی

'شب خون'۔ الٰہ آباد

13 ستمبر 2018

شبلی کا ذکر خود نوشتوں میں کے بعد ناچیز نے کلام شبلی کے اعلام واشخاص پر کام شروع کیا۔ اس کے ساتھ ہی فرہنگ کلام شبلی بھی تیار کرنے کی کوشش کی۔ چونکہ یہ میرے لئے بالکل نیا موضوع تھا اور فاروقی صاحب اس کے مرد میداں تھے، چنانچہ میں نے ان کی کتاب ''لغات روزمرہ'' منگائی اور فاروقی صاحب کو لکھا کہ میں فرہنگ کلام شبلی تیار کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کی لغات روزمرہ منگالی ہے اور اس سلسلہ میں آپ کے مفید مشوروں کا متمنی ہوں۔ اس کے جواب میں ان کا چند سطری خط آیا اور واقعہ یہ ہے کہ ایسا صائب مشورہ وہی دے سکتا ہے جو موضوع پر انتہائی گہری نظر رکھتا ہو۔ انہوں نے لکھا:

> ''لغات روزمرہ اس کام کے لئے بیکار ہے۔ نور اللغات اور آصفیہ اشد ضروری ہیں۔ فارسی کا ایک لغت مثلاً ''بہار عجم'' یا آنند راج بھی رکھیں۔ فیروز اللغات اور فرہنگ عامرہ سے دور رہیں۔ بہار یا آنند راج نہ ملیں تو بدرجۂ مجبوری کشوری کو دیکھیں۔'' (29 جون 2020)

سچ ہے فاروقی صاحب جیسے اہل علم اور باکمال اشخاص صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ وہ جتنے بڑے ادیب ونقاد تھے، اتنے ہی بڑے زباں داں اور ماہر لغات بھی تھے۔ تنقید کے متنوع پہلوؤں پر وہ عالمانہ نظر رکھتے تھے۔ علاوہ ازیں وہ ایک بڑے شاعر، افسانہ نگار اور ناول نگار تھے۔ جس طرح شعر شور انگیز کبھی نظر انداز نہیں کی جاسکے گی اسی طرح ''کئی چاند تھے سر آسماں'' سے بھی صرف نظر نہیں کیا جاسکے گا۔ اس ناول کے بارے میں انہوں نے بتایا تھا کہ کئی زبانوں میں اس کا ترجمہ شائع ہو چکا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ سرمایہ ہماری زبان کا راس المال ہے۔

مجھے اس بات کا فخر حاصل ہے کہ فاروقی صاحب میری تحریریں پڑھتے تھے۔ اغلاط کی نشاندہی کرتے، حوصلہ افزائی کرتے۔ یہی نہیں مجھے اردو اکادمی لکھنؤ اور مغربی بنگال اردو اکادمی کے انعامات ملے تو انہوں نے مبارک باد دی اور تہنیتی کلمات کہے۔ شبلی کالج کے شعبۂ اردو نے مجھے ''امتیاز شبلی'' سے سرفراز کیا اور اس کی خبر اخبارات میں مع تصویر شائع ہوئی تو انہوں نے میرے بیٹے سے کہا کہ میری مبارک باد پہنچا دینا اور یہ تمہارے باپ نے اپنے بال ابھی سے گنوا دیئے، کہو کم محنت کرے۔ یہ شفقت آمیز باتیں اب افسانہ ہو گئیں۔

میرا بیٹا الٰہ آباد میں بی ٹیک کر رہا ہے اس لئے چند برس سے یہ سہولت ہو گئی تھی کہ وہ فاروقی صاحب سے ملاقات کے لئے چلا جاتا، کتابیں اور سلام پہنچا دیتا اور وہاں سے خیر وعافیت کی اطلاع کے ساتھ کتب ورسائل بھی لے آتا۔ اب مجھ سے زیادہ وہ اس سے خوش رہنے لگے تھے۔ ان کا انتقال ہوا تو مجھ پر جو بیتی وہ بیتی میرے بیٹے کو بھی بہت قلق ہوا۔

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

میری آخری کتاب جو ان کی خدمت میں پہنچی وہ مقالات کا مجموعہ 'نقوش شبلی' تھی۔ اس کے بارے میں فاروقی صاحب کا دوسطری واٹس ایپ میسج آیا کہ ''باوجود ضعف بصارت زیادہ تر اسی وقت پڑھ لیا۔ لاجواب کتاب ہے۔'' (9 اکتوبر 2020)

اس کے بعد وہ بیمار ہو گئے۔ کورونا کی زد میں آئے۔ الٰہ آباد سے دہلی منتقل ہوئے۔ احباب سے خیر وعافیت معلوم کرتا رہا۔ پہلے مایوس کن خبریں آئیں، پھر اطلاع ملی کہ اب بہتر ہیں۔ کئی بار پروفیسر احمد محفوظ صاحب سے خیر وعافیت معلوم کی، لیکن 25 دسمبر (2020) کو ان کی وفات کی خبر ملی۔ میں اس وقت لکھنؤ علاج کے لئے گیا ہوا تھا۔ الٰہ آباد نہ جاسکا۔ اس طرح آخری بار ان کو نہ دیکھ سکا اور نہ ایک مٹھی مٹی دے سکا۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور ان کی قبر کو نور سے بھر دے۔

اپریل 2020 میں ان کے یار غار ڈاکٹر ابرار اعظمی نے وفات پائی تو میں نے ہمت کر کے انہیں مطلع کیا۔ انہیں بڑا سخت صدمہ پہنچا اور کہا کہ اب جی کے کیا کریں گے۔ کس کو معلوم تھا کہ اب وہ بھی تیار بیٹھے ہیں۔ دوسرے دن فون آیا کہ ابرار خاں پر کچھ لکھنے کی ہمت نہیں ہو رہی ہے تم ایک اچھا سا مضمون لکھ دو۔ میں نے ان کے حکم کی تعمیل میں مضمون لکھا تو بہت پسند کیا اور اسے اوراق سبز ڈاٹ کام (auraqesabz.com) اور ہماری زبان دہلی میں شائع کرایا اور مجھے لکھا کہ یہ مضمون ان کے بیٹے شہاب کو بھی بھیج دو۔

ان دونوں کے درمیان بڑا گہرا یارانہ تھا۔ دونوں بچپن کے ساتھی تھے۔ میاں جی اسلامیہ انٹر کالج گورکھپور کے ہم سبق تھے۔ دونوں نے میدان شعر وادب میں ساتھ ہی قدم رکھا۔ اسلامیہ انٹر کالج میگزین میں دونوں کی تخلیقات چھپی ہیں۔

ابرار صاحب نے ان پر متعدد مضامین لکھے۔ ایک مضمون میں فاروقی صاحب کی تصنیفات وتالیفات کی مکمل فہرست درج کی ہے اور ان کا مختصر تعارف کرایا ہے۔ فاروقی صاحب کے ابتدائی دور کے بعض افسانے اور ناولٹ جو فاروقی صاحب کے پاس محفوظ نہیں تھے ابرار صاحب کے پاس محفوظ تھے، ان کو یکجا کر کے حواشی اور ضروری تعلیقات کے ساتھ ''بازیافت'' کے نام سے شائع کیا۔

فاروقی صاحب بھی ان سے بے پناہ محبت کرتے تھے، ان کی آخری کتاب تنقیدی معاملات کا انتساب ڈاکٹر ابرار اعظمی کے نام ہے۔ ابرار اعظمی صاحب تو ان کے ایسے عاشق زار تھے کہ ان کی ساری گفتگو کا خاتمہ فاروقی صاحب پر ہوتا تھا۔ مجھے ان دونوں بزرگوں کی شفقت حاصل تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ ان دونوں کی وفات سے میں خود کو یکہ وتنہا محسوس کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ ان کی لغزشوں سے صرف نظر کرے اور ان پر اپنی رحمتوں کی بارش کرے۔ آمین ☆☆

عمران عاکف خان



وہ جو ماہ وانجم تھے اردو کی کائنات کے

مشرف عالم ذوقی اور ڈاکٹر ترنم ریاض کی یاد میں!

یوں تو دنیا میں کسی کے رہنے نہ رہنے سے کام بند نہیں ہوتے مگر اتنا ضرور ہے جو کام کچھ خاص افراد سے وابستہ یا متعلق ہو جاتے ہیں ان کے چلے جانے کے بعد ان کی عدم تکمیل اور ادھورا پن بہت زیادہ کھلتا ہے۔ خاص طور سے اس وقت ان کی یاد تڑپا کر ہی رکھ دیتی ہے جب اُن اُمور کی انجام دہی کا کوئی موقع آتا ہے مگر یاد کرنے والا اسے قدرت وفطرت کا فیصلہ مان کر چپ رہتا ہے ورنہ اس کے اندر کے کرب احساس تو ارض وسما کے جگر دہلا دیتا ہے۔ 21-20-2019 —— 21ویں صدی یہ تین سال ایسے گزرے ہیں (ممکن ہے آنے والے چند سال بھی ایسے ہی گزریں) ان میں پوری دنیا وں سمیت، کائنات اردو کا بھی ناقابل تلافی نقصان ہوا ہے۔ مذکورہ برسوں میں برپا عالمی بیماری، کووڈ-19 نے ہماری کائنات سے ایسے ایسے چاند تارے بلکہ کہکشائیں چھینی ہیں جن کے دم سے یہاں رونقیں اور تابندگیاں موجود تھیں۔ مشرف عالم ذوقی، تبسم فاطمہ اور ڈاکٹر ترنم ریاض کا شمار ان ہی میں ہوتا ہے۔ یہ مضمون جو مختلف رائٹ اَپس کی شکل میں ہے، ان ہی کی یاد میں ہے اور ان کو ہی معنون ومنسوب ہے۔

ذوقی افسانہ ہوگئے

یہ شہر دہلی ہے، آفتاب نصف النہار پر ہے، یوم الجمعہ ہے، وطنِ عزیز کی آزادی کی تاریخ 15 اگست 2003 ہے، میرے قدم گیتا کالونی میں واقع تاج انکلیو کی طرف بڑھ رہے ہیں، مجھے تلاش تھی مشرف عالم ذوقی کی، وہ تاج انکلیو میں رہائش پذیر تھے۔ ذوقی سے ملاقات کا ایک اشتیاق تھا ان کا افسانوی مجموعہ ''صدی کو الوداع کہتے ہوئے'' (2000) کو پڑھ کر ماہ نامہ شاعر ممبئی (فروری 2000) کے لیے تبصرہ لکھ چکا تھا۔ میں اور میرے ساتھی ڈاکٹر طیب خرادی جب ذوقی کے اپارٹمنٹ کے باہر کھڑے تھے۔ میری آنکھیں ان کی رہائش گاہ کے صدر دروازے پر ٹھہر سی گئی تھیں۔ دروازے کے اطراف میں کتابوں کی الماریاں رکھی ہیں اور ان میں کتابیں سلیقے سے سجی ہوئی ہیں۔ کال بیل کی آواز پر دروازہ کھلا۔ میں نے دیکھا مشرف عالم ذوقی استقبال کو کھڑے ہیں۔ میں نے ذوقی صاحب کو رسائل میں ان کی تخلیقات کے ساتھ شائع تصویر میں دیکھا تھا۔ یہ ان سے پہلی ملاقات تھی۔ پہلی ملاقات کی روشن یادیں آج تک میری آنکھوں میں قید ہیں۔ میں نے ان سے گفتگو کے دوران محسوس کیا تھا کہ وہ ایک اینگری ینگ مین کتھا کار ہیں۔ جنھوں نے زندگی کو اپنے تخلیقی ادب کا موضوع بنایا تھا۔ اظہار وبیان کی رگیں حساس تھیں ان کی گفتگو میں صرف اور صرف فکشن کی باتیں تھیں۔ کبھی وہ بہار کی فکشن کی بات کرتے کبھی وہ دکن کے معتبر فکشن نگاروں اقبال متین، جیلانی بانو، حمید سہروردی، مظہر الزماں خان، بیگ احساس، نور الحسنین کی خیر خیریت جانتے ہوئے جدیدیت جیسے رجحان کی ناکامی اور کامیابی پر بات کرتے تھے۔ ذوقی کو دیکھنے دکھانے کے بعد لگتا تھا وہ خوش لباس، خوش مذاق، خوش خصال اور خوش گفتار ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ وہ نصف بہتر تبسم فاطمہ اور بیٹا شاشا عالم کے ساتھ خوش وخرم زندگی بسر کر رہے تھے۔ اگرچہ ذوقی کو بیٹی صحیفہ عرف انعمیۃ کی موت کا صدمہ تھا اور اس سے قبل ان کے والد گرامی مشکور عالم بصیری نے فرشتۂ اجل کو لبیک کہا تھا۔ میری اور محترم ذوقی کی گفتگو جاری تھی بھابھی جان تبسم فاطمہ نے پرتکلف ظہرانے کا نظم کیا تھا۔ میں نے اور ذوقی نے کھانا تناول کیا۔ کھانے کے دوران وہ دہلی کی ادبی سیاست اور افسانہ نگاروں کے حال واحوال کو آئینہ کرتے رہے۔ شام ہو چلی تھی مشرف عالم ذوقی کے ساتھ وہ لمحات کیسے گزرے، پتہ ہی نہیں چلا۔ وہ اور بھابھی تبسم فاطمہ تاج انکلیو کے گیٹ تک وداع کرنے آئے تھے۔ ذوقی نے 15 اگست کی مناسبت سے اپنے مخصوص انداز میں کہا تھا ''آزادی کی ایک اور شام ڈھل گئی۔''

ذوقی کی زندگی سخت کوشی اور بہادری سے عبارت تھی وہ اردو وہندی کے فکشن میں راکھ کی چنگاری کی طرح ابھرے تھے۔ وہ ایک دبنگ تخلیقی مصنف تھے اسی لیے ان کے فن پارے میں احتجاج کی لہر ملتی تھی۔ ان کا ادبی سفر برق رفتار تھا۔ اس میں ہمارے عہد کی دھڑکنیں شامل تھیں۔ انھوں نے فکشن نئے ابعاد میں تخلیق وتحریر کیا تھا۔ ان کی سماجی، ثقافتی اور سیاسی بصیرت تیز تھی، ان کا منفرد اسلوب تھا۔ زبان وبیان کی ایسی سلاست تھی کہ قاری افسانہ سے جڑا رہتا تھا۔ وہ قاری سے راست مکالمہ کرتے تھے۔ ہر افسانے میں نئے نئے الفاظ نے ان کے افسانوی اسلوب کو نیا آہنگ عطا کیا تھا۔

مشرف عالم ذوقی نے زندگی کے مختلف رنگ اور بہاریں دیکھی تھیں اور اق حیات پر جہد مسلسل لکھا تھا طویل افسانے وہ لکھتے تھے لیکن حیات کا افسانہ مختصر لکھا اور افسانہ ہو گئے۔ ان کی اس ادا پر ان کی عنوانِ حیات، تبسم فاطمہ بھی چل پڑی اور یوں ایک رومانی افسانے کا کلائمکس ہوا۔ مشرف عالم ذوقی عالم بالا سے اپنے مداحوں اور خیر خواہوں کو علامہ سیماب اکبر آبادی کی زبان میں پیغام دیتے ہیں:

بھرے گی ان کو میرے بعد لاکھوں رنگ سے دنیا
خلائیں چھوڑ دی ہیں میں نے کچھ اپنے فسانے میں

—————— **ڈاکٹر غضنفر اقبال**

مشرف عالم ذوقی کے ناولوں کا سیاسی بیانیہ

پریم چند نے ترقی پسند تحریک کے پہلی کل ہند کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا: ''ادب سیاست کے آگے چلنے والی مشعل ہے۔'' لیکن ناقدین ادب نے ایسے ادب کو درخور اعتنا سمجھا جس میں عصری سیاست کو موضوع بنایا گیا ہو۔ ادبی ناقدین نے متن میں سیاسی رویوں کی تلاش وجستجو کے بجائے خود کو فنی لوازمات کے برتاؤ تک ہی محدود رکھا کیوں کہ بادی النظر میں ان کے لیے تخلیق کار کا یہ رویہ ادب کے بجائے سیاست کے زمرے میں آتا ہے جس سے دوری اور برگشتگی کو وہ اپنے لیے مناسب ترین تصور کرتے ہیں۔ حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ کوئی بھی ادب سیاسی اور سماجی سروکاروں کے بغیر مفید نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا اس طرح کے موضوعات پر ناقدین کو غور وفکر کرنا چاہیے۔

قطع نظر ناقدین کی آرا اور نظریات کے ہمارے فکر مند اور حساس ادیبوں اور فن کاروں نے اپنے فن میں سیاست اور سماج کے مسائل کو بڑے پیمانے پر بیان کیا اور وسیع کینوس پر ابھارا ہے۔ ایسے ہی ادیبوں اور فن کاروں میں مشرف عالم ذوقی کا بھی شمار ہوتا ہے۔ ذیل میں

گورنمنٹ کالج لکشمن گڑھ، سیکر 332311 (راجستھان)
فون: 9911657591 imranakifkhan@gmail.com

ان کے تین ناولوں 'بیان'، 'لے سانس بھی آہستہ' اور 'پو کے مان کی دنیا' کی روشنی میں ذوق کے سیاسی بیانیے کو بیان کرنے کی سعی کی گئی ہے۔

'پو کے مان کی دنیا' سائنس فکشن کا بہترین نمونہ ہے لیکن یہ مستقبل کو نہیں بلکہ حال کو بیان کرتا ہے کہ سائنس نے کس طرح نئی نسل کو اپنی گرفت میں لے لیا ہے۔ علاوہ ازیں ناول میں موجودہ دور کی سیاست بھی سانس لیتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ مشرف عالم ذوقی نے اس ضمن میں اپنے قلم کو بہت بے باک انداز میں بے مہار چھوڑ دیا یہاں تک کہ ملک کی معروف سیاسی جماعتوں اور ان کی سیاسی پالیسیوں کا واضح انداز میں بیان کیا ہے۔ سیاست کس طرح عدالتی نظام میں دخیل ہو کر اپنے حق میں فیصلہ کرانے کے لیے جج کو مجبور کرتی ہے، ناول نگار نے اسے بھی بہت ہی اچھے انداز میں پیش کیا ہے۔ اس بات کو انھوں نے کرداروں کے ذریعے اور ان کو درپیش مسائل وسانحات کے ذریعے واضح کیا ہے۔

مذکورہ بالا تینوں ناولوں کے بغور مطالعے سے جہاں متعدد انکشافات قاری پر منکشف ہوتے ہیں وہیں یہ بھی انداز ہوتا ہے کہ مشرف عالم ذوقی کی سیاست پر کتنی گہری نظر تھی۔

——— **محمد حنیف خان**

شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

مشرف عالم ذوقی سے ایک ملاقات

آج سے تقریباً پانچ سال قبل 2017 میں مجھے مشرف عالم ذوقی کے گھر جانے کا شرف حاصل ہوا تھا۔ وہ دن اتوار کا تھا۔ ذوقی صاحب اس دن خاص طور پر طلبہ سے ہی ملتے تھے۔ اس دن میری ہی طرح چند ریسرچ اسکالرس اور دیگر افراد بھی پہنچے تھے۔ ہم سب نے ایک ساتھ ہی ذوقی صاحب کے دولت کدے پر دستک دی۔ ان کے استقبال کرنے کا انداز مجھے بے حد پسند آیا۔ پہنچتے ہی انھوں نے خیریت دریافت کی تھی۔ میں پہلی دفعہ ان سے ملنے گیا تھا۔ انھوں نے راستے کی دشواریوں اور سواری کی دقتوں کے بارے میں پوچھا۔

انھوں نے ہمیں اس کمرے میں بٹھایا تھا جہاں وہ دیر رات تک اپنے تخلیقی کام میں مشغول رہتے تھے۔ دیوار کی ایک طرف سے ایک بڑا صوفہ اور دو سنگل صوفے تھے۔ وہاں دس بارہ لوگوں کے بیٹھنے کی جگہ تھی۔ دوسری طرف سے ایک لمبا مخروطی شکل کا ٹیبل تھا جس پر دو کمپیوٹر رکھے ہوئے تھے۔ رات کی خاموشی میں کاغذ پر وہ جو کچھ رقم کرتے تھے دن میں وہ اسے کمپیوٹر میں محفوظ کر دیتے تھے۔ گیٹ کے سامنے ہی ایک بڑی سی آرام دہ کرسی تھی جس پر وہ اپنے خاص انداز میں بیٹھے ہوئے تھے۔ چہرہ ہشاش بشاش اور بے باک نظر آ رہا تھا۔ ویسے وہ فطری طور پر بھی بے باک اور بے خوف انسان تھے۔ ان کی آرام دہ کرسی کے ٹھیک پیچھے دیوار کی الماری میں بے شمار کتابیں سجی ہوئی تھیں۔ کمرے کے شمالی حصے کی دیوار سے ایک بڑی کھڑکی لان کی طرف کھلتی تھی۔ کمرہ صاف ستھرا اور نکھرا ہوا تھا۔ ہر چیز سلیقے سے رکھی ہوئی تھی۔ کمرے کی نفاست دیکھ کر مجھے ان کی تحریر کی نفاست یاد آ گئی۔ جس طرح ان کی نثر میں کوئی ابتری اور بکھراؤ نہیں ہوتا اسی طرح ان کے عام طرز زندگی میں بھی کوئی بے ترتیبی نظر نہیں آئی۔

ذوقی صاحب مہمان نوازی کے سلیقے سے خوب واقف تھے۔ ہمارے پہنچتے ہی انھوں نے پینے کے لیے پہلے ٹھنڈا پانی پیش کیا۔ تھوڑی دیر بعد پھر شربت منگوایا۔ گرمی کی کاٹ کے لیے مشروبات کی دو تین قسمیں پلک جھپکتے سجا دی گئیں۔ انواع واقسام کے کیکس، بسکٹس اور مٹھائیاں بھی دسترخوان پر پروس دی گئیں۔ اتنی خاطر داری کرنے کے بعد وہ بڑے ہی نرم لہجے میں بولے: ''بھائی بات دراصل یہ ہے کہ تبسم گھر پر نہیں ہیں۔ اگر وہ ہوتیں تو شاید اس سے بہتر انتظام ہوتا۔ اگر کچھ کمی رہ گئی ہو تو معذرت۔'' میں بڑا حیران تھا کہ اتنا بڑا قلم کار ادب کے مبتدی قارئین کے ساتھ کتنی انکساری سے پیش آ رہا ہے۔ انسان جب بڑا ہوتا ہے تو اس کے اندر خاکساری اور تواضع پیدا ہو جاتی ہے۔ مشرف عالم ذوقی بڑے ناول نگار اس لیے بھی تھے کہ وہ ایک اعلیٰ سوچ کے انسان تھے۔

مجھے یاد نہیں آ رہا ہے کہ رسمی بات چیت کے بعد ادبی گفتگو کیسے اور کب شروع ہوئی۔ میں تو بس ان کو پڑھے جا رہا تھا، جیسے کوئی ان کی تحریروں میں ڈوب جاتا ہے میں ان کی شخصیت میں کھو گیا تھا۔ جب میں ان کی شخصیت کے سحر سے باہر نکلا تو انھیں لکھنے کی عمر پر بات کرتے ہوئے پایا۔

ذوقی صاحب کہہ رہے تھے کہ لکھنے کے لیے عمر کی کوئی قید نہیں ہوتی۔ انھوں نے اردو اور مغربی ادب سے ان ادیبوں کے نام گنوائے جنھوں نے نہ صرف کم عمر میں لکھنا شروع کیا بلکہ وہ کم عمری میں وفات بھی پا گئے، تاہم ان کے نام اور کارناموں سے پوری دنیا واقف ہے۔ جو نام مجھے یاد رہ گئے یا جن کے بارے میں مجھے پہلے سے معلوم تھا ان میں اردو کے مجاز اور انگریزی کے کیٹس قابل ذکر ہیں۔ کیٹس کا انتقال 25 سال کی عمر میں ہو گیا تھا۔ لیکن انگریزی شاعری کی تاریخ ان کے بغیر نامکمل ہے۔

فرانسیسی اور روسی ادیبوں پر گفتگو زیادہ مرکوز رہی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان دونوں زبانوں کا ادب زیادہ رچ ہے۔ ادب پر گفتگو ہوگی تو فرانسیسی اور روسی ادب کا کچھ زیادہ ذکر ہونا فطری ہے۔ میں بھی ان کی گفتگو میں شریک ہو جاتا تھا۔ وہ مجھے اس کا موقع بھی دے رہے تھے۔ یہ صفت ایک بڑے فنکار کے یہاں ہی پائی جاتی ہے۔ وہ صرف اپنی بات نہیں کہتے، دوسروں کے خیالات کو بھی جگہ دیتے ہیں۔ فرانسیسی ادب کے تراجم پر میرا کام ہے اس لیے میں زیادہ دلچسپی بھی لے رہا تھا۔ جہاں کچھ چیزیں مبہم معلوم ہوتی تھیں، ان کے متعلق درمیان میں سوال بھی کر لیتا تھا۔ وہ فوری ان سوالوں کے اطمینان بخش جواب بھی دیتے تھے۔ برصغیر ہند و پاک میں جو فکشن لکھا جا رہا ہے، اس کی کیا صورت حال ہے اور آنے والے دنوں میں کس طرح کا فکشن لکھا جائے گا، اس کا انھوں نے بھرپور جائزہ لیا۔ ان کی گفتگو سے میرے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ وہ عالمی ادب سے اچھی واقفیت رکھتے تھے۔ میں نے ان کی گفتگو میں ان کی تحریر کی سی روانی پائی۔ زبان کی صفائی ان کی سب سے اہم خوبی ہے۔ ان کو میں نے پڑھا ہے۔ 'پو کے مان کی دنیا' اور 'لے سانس بھی آہستہ' یہ دونوں ناول میرے مطالعے کا حصہ رہے ہیں۔ ان کو سنتے ہوئے ایسا لگ رہا تھا جیسے میں ان کو پڑھ رہا ہوں۔ ہم لوگ ان کے یہاں تقریباً تین گھنٹے تک بیٹھے رہے لیکن ان کی گفتگو کی چاشنی نے ایسا سحر پیدا کر دیا تھا کہ وقت کے گزرنے کا پتہ ہی نہیں چلا۔ وہ اتنی مفید اور معلوماتی باتیں کر رہے تھے کہ بس سنتے ہی رہنے کو جی چاہ رہا تھا۔ ادھر سورج تھا کہ اس دن کچھ پہلے ہی غروب ہو گیا تھا اور شام تاریکی کا لبادہ اوڑھنے کو بضد تھی۔ اس لیے مجلس بادل نخواستہ برخاست کی گئی۔

آخر میں چلتے چلتے انھوں نے ایک دلچسپ اور حقیقت پر مبنی بات بتائی کہ ادب کو سمجھنے کے لیے وقت کی قربانی دینا ہوتی ہے۔ ادب کے لیے اپنے آپ کو وقف کرنا ہوتا ہے۔ ہمارا بدن جب تک ادب کی بھٹی میں نہیں تپتا اس وقت تک نہ ادب کی تخلیق ہوتی ہے اور نہ اس کی سمجھ پیدا ہوتی ہے۔ ادب کی بھٹی میں ہم اپنے جسم کو جلا کر ہی ادب کو سمجھنے والا دل اور روح تیار کرتے ہیں۔ ادب کا رشتہ انسان کے دل اور اس کی روح سے ہوتا ہے۔

بہر کیف وہ ملاقات بہت خوشگوار تھی۔ آتے وقت انھوں نے مجھے اپنا ناول ''نالۂ شب گیر'' مطالعے کی غرض سے دیا تھا۔ ناول دیتے وقت ایک اور اہم بات انھوں نے کہی تھی کہ آپ میری باتوں سے اختلاف کر سکتے ہیں اور کرنا بھی چاہیے لیکن اختلاف کرنے سے پہلے پڑھیے ضرور۔ دراصل وہ یہ کہنا چاہ رہے تھے کہ میرے ناولوں کے متن اور مواد سے اختلاف کر سکتے ہیں لیکن آپ کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ آپ کس چیز سے اختلاف کر رہے ہیں۔

.....اب جب کہ مشرف عالم ذوقی ہمارے بیچ نہیں ہیں، مجھے ان کی ایک ایک بات یاد آ رہی ہے اور میں پل پل بے چین ہو رہا ہوں۔ میں آج بھی یہ تحریر لکھتے ہوئے کف افسوس مل رہا ہوں کہ کاش میں ان کی زندگی میں ان کے ناولوں کے حوالے سے کچھ لکھ پاتا۔

——— **محمد ریحان، جامعہ ملیہ اسلامیہ**

باب ڈاکٹر ترنم ریاض:

دختر کشمیر: ترنم ریاض کا تخلیقی سفر

جموں و کشمیر میں اردو زبان و ادب کی خدمت کرنے اور فروغ اردو کے حوالے سے

یکساں طور پر جن کو صاحبان علم وادب کا بلند مقام حاصل ہوا ہے، ان میں ایک نام دختر کشمیر ڈاکٹر ترنم ریاض کا بھی ہے۔ اردو برادری میں دختر کشمیر کا مطلب صرف ڈاکٹر ترنم ریاض ہے۔ ان کا اصلی نام فریدہ اختر ترنم تھا۔ ان کی ولادت 9/اگست 1953 کو کشمیر کے معروف علاقے ''کرن نگر'' میں ہوئی۔ ڈاکٹر ترنم ریاض نے ابتدائی اور اعلیٰ تعلیم سری نگر سے حاصل کی۔ اردو میں ایم اے (اردو) ایم اے (ایجوکیشن) اور پی ایچ ڈی (ایجوکیشن) کی ڈگری حاصل کی۔ ادبی زندگی کا آغاز 1973 میں کیا۔ پہلی کہانی روزنامہ 'آفتاب' میں شائع ہوئی اور پہلا افسانوی مجموعہ 1998 میں شائع ہوا جس کی وجہ سے انھیں دہلی میں بہت شہرت حاصل ہوئی، کیوں کہ ان کی زندگی کا بیشتر حصہ دہلی میں گزرا۔ ان کی شادی کشمیر کے مشہور ادیب اور سوشل سائنٹسٹ ریاض پنجابی سے ہوئی۔ ترنم ریاض کو ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں مختلف اعزازات سے نوازا گیا۔ 2014 میں انھیں سارک کا ادبی ایوارڈ ملا۔ وہ ساہتیہ اکادمی کی گورننگ کونسل اور مشاورتی بورڈ کی ممبر تھیں۔ علاوہ ازیں سرسوتی سمان ایوارڈ کمیٹی کی رکن، غالب اکیڈمی گورننگ کونسل کی رکن اور انٹرنیشنل سینٹر فار پیس اسٹڈیز سے بھی وابستہ تھیں۔ ترنم ریاض تادم حیات وزارت ثقافت (حکومت ہند) میں سینئر فیلو کی حیثیت سے سرگرم رہیں۔ برقی میڈیا سے بھی وابستہ تھیں۔ انھوں نے ملکی و بین الاقوامی مشاعروں، سمیناروں، ورکشاپ اور ادبی مذاکروں میں بھی شرکت کی۔ ان کے افسانوی مجموعے ''میرا رختِ سفر'' کو جموں کلچرل اکیڈمی کی جانب سے سال کی بہترین کتاب قرار دیا گیا۔

افسانوں کے علاوہ ترنم ریاض کے دو ناول اور ایک ناولٹ کا مجموعہ منظرِ عام پر آ کر ادبی دنیا میں مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔ پہلا ناول ''مورتی'' (2004) میں اور دوسرا ناول ''برف آشنا پرندے'' (2009) میں شائع ہوا۔ ناول 'مورتی' کا موضوع ازدواجی زندگی کے مسائل اور ناکامی کے اسباب ہے۔ یہ ناول فن مجسمہ سازی سے ان کی گہری دلچسپی کا احساس دلاتا ہے۔ ناول ''برف آشنا پرندے'' نے اردو دنیا میں بہت جلد مقبولیت حاصل کر لی۔ اس ناول میں کشمیری معاشرت، تہذیب، تاریخ، خوبصورت مناظر اور وہاں کے مسائل کی مکمل عکاسی کی گئی ہے۔ کشمیر کے تاریخی واقعات نے اس ناول کو بے مثال بنا دیا ہے۔ ترنم ریاض کے مختصر ناولوں کا ایک مجموعہ ''فریبِ خطۂ گل'' کے عنوان سے 2009 میں منظرِ عام پر آیا۔ یہ مجموعہ بھی ان کی فکشن نگاری کے سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

ترنم ریاض کے شعری مجموعوں میں ''پرانی کتابوں کی خوشبو'' (2006) اور ''زیرِ سبزہ محوِ خواب'' (2015) شامل ہیں۔ اس کے علاوہ ماہیوں کا ایک مجموعہ ''بھادوں کے چاند تلے'' (2015) بھی قابل ذکر ہے۔ مجموعہ ''پرانی کتابوں کی خوشبو'' میں نظمیں اور غزلیں درج ہیں۔ ''زیرِ سبزہ محوِ خواب'' میں پابند نظمیں، آزاد نظمیں، شام کی نظمیں اور غزلوں کے علاوہ متفرق اشعار بھی موجود ہیں۔ ساتھ میں ان کی تخلیقات پر مختلف شخصیات کی آرا کو بھی جگہ دی گئی ہے۔ ترنم ریاض کی شاعری بلاشبہ ایک معتبر اور سنجیدہ آواز ہے جو زندگی کے مختلف پہلوؤں اور رویوں کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ جس میں نہ کوئی تصنع ہے نہ اکہرا پن بلکہ نسوانی جذبات و احساسات کو ترنم ریاض نے اپنی غزلوں اور نظموں کو لطافت اور شگفتگی سے پیش کیا ہے۔ کشمیر کے دل کش نظاروں کے درمیان دہائیوں سے بارود، خون، کرفیو اور تشدد کے جو رنگ شامل ہوئے ہیں ان کا اظہار ان کی شاعری میں نظر آتا ہے۔

ترنم ریاض کو عورت کی عظمت کا احساس ہے۔ اس لیے وہ عورت کی بھرپور نمائندگی اور وکالت کرتی ہیں۔ عورت کو روایتی اور فرسودہ بندشوں سے آزاد کرنے کی کوشش کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ یہاں پر اخلاقی اقدار کی حامل بھی ہیں اور روایت پسند بھی۔ وہ لبرل بھی ہیں اور قدامت پسند بھی۔ غزلیہ شاعری میں بھی مایوس کن حالات و واقعات کی وقوع پذیری پر اظہار تاسف ملتا ہے۔

——— **ڈاکٹر شاداب تبسم۔ دہلی**

یاد ترنم ریاض

ترنم ریاض اردو کی ایک ممتاز فکشن نگار کے ساتھ منفرد لب ولہجہ کی شاعرہ بھی ہیں۔ ان کی تخلیقات کا کینوس وسیع اور ان کے موضوعات متنوع ہیں۔ انھوں نے مرد اساس معاشرے میں عورتوں کے مسائل کو ہی نہیں سمیٹا بلکہ انھیں درپیش نئے چیلنجز پر بھی کھل کر اظہار خیال کیا ہے۔ ان کے یہاں ایک طرف جہاں اپنے ملک کے خطۂ کشمیر، دہلی اور پنجاب وغیرہ کی تہذیب و ثقافت کا عکس دکھائی دیتا ہے وہیں دوسری جانب امریکہ اور عرب ممالک کے تمدن کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔ ترنم ریاض کے پاس نہ صرف یہ کہ بہت ساری کہانیوں سے بھرا ہوا دماغ اور مختلف جذبات و احساسات سے مملو دل ہے بلکہ ان کے اظہار کے متعدد وسائل، تکنیک اور خوبصورت زبان و بیان سے مزین اسلوب بھی ہے۔ مختصراً یہ کہ وہ ایک ایسی باکمال ادیبہ تھیں جن کے فکر و فن میں خوب پختگی تھی اور جو اپنے رشحات قلم سے نظم و نثر کے کئی جواہر پارے بطور یادگار چھوڑ کر ہم سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئیں۔

——— **مصطفیٰ علی، جامعہ ملیہ اسلامیہ**

ترنم ریاض: ادیب و شاعرہ

اردو ادب کے فروغ میں خواتین نے یوں تو ابتدا سے ہی اپنا کردار نبھایا ہے لیکن ان کو شناخت بیسویں صدی سے ملنا شروع ہوئی۔ انیسویں صدی کے اخیر اور بیسویں صدی کے آغاز سے خواتین ادیبوں نے ادبی دنیا میں اپنے قدم جمانے شروع کر دیے۔ ان خواتین ادیبوں نے ہر صنف ادب میں نام کمایا اور ہر موضوع کو برتا۔ تاہم بہت کم ایسی خاتون ادیب ہوئیں جنھوں نے نظم و نثر دونوں میں قابل ذکر ادبی سرمایہ چھوڑا۔ ان ادیبوں میں ڈاکٹر ترنم ریاض کا بھی نام ہے۔

ڈاکٹر ترنم ریاض اردو ادب کی مشہور فکشن نگار اور شاعرہ ہیں۔ انھوں نے افسانے سے اپنے ادبی سفر کا آغاز کیا اور بطور فکشن نگار مشہور ہوئیں لیکن انھوں نے شاعری کی جانب بھی توجہ کی اور ان کے کئی شعری مجموعے بھی منظر عام پر آئے۔

اردو کی خواتین فکشن نگاروں میں ترنم ریاض کا اپنا ایک اسلوب ہے اور ان کی اپنی ایک ڈکشن ہے۔ ان کے افسانے جدیدیت یا کسی خاص رجحان سے متاثر نہیں ہیں اور ان کا بیانیہ سادہ ہونے کے باوجود سپاٹ یا اکہرا نہیں ہے۔ وہ اپنے افسانے میں تشبیہات و استعارات اور تلمیحات کا استعمال کرتی ہیں۔ زبان و بیان پر ان کی گہری نظر ہے۔

ان کے اسلوب کی تعریف کرتے ہوئے نیر مسعود لکھتے ہیں:

''ترنم ریاض نے اچھے موضوعات کا انتخاب اور لکھنے کے لیے مناسب اسلوب اختیار کیا ہے۔ افسوس کہ یہ بنیادی اور بہت ضروری صفت ہمارے یہاں سے ناپید ہوتی جا رہی ہے۔''

ترنم ریاض کی بیشتر کہانیوں میں نسائی شعور کی بھرپور جھلک ملتی ہے۔ ان کی تخلیقات میں مرد اساس معاشرے کے خلاف احتجاج کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔

ترنم ریاض کی تخلیقات میں کشمیر جیسے خوبصورت علاقے کی عکاسی بدرجۂ اتم موجود ہے۔ ان کے ناول 'برف آشنا پرندے' کو کشمیر کی تاریخی دستاویز کہا جا سکتا ہے۔ کشمیر کی تاریخ، تہذیب و تمدن، ثقافت، سیاست، معاشرت اس ناول کا حصہ ہیں۔ ترنم ریاض بطور فکشن نگار اور شاعرہ کی حیثیت سے احترام کی نظروں سے دیکھی جاتی ہیں۔ عورتوں کے مسائل کے ساتھ ساتھ ان موضوعات پر بھی توجہ کرنے کی کوشش کی ہے جن سے ہم کسی نہ کسی طور پر متاثر ہیں۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ آج کے منظر نامے پر محیط ان کے افسانے اپنی تمام تر تلخیوں کے ساتھ ساتھ زندگی کی شادمانیوں کے اطراف بھی پیش کرتے ہیں۔

افسانہ نگاری اور دیگر اصناف کے ساتھ ساتھ شاعری میں بھی ترنم ریاض نے طبع آزمائی کی اور کمال کی بات یہ ہے کہ یہاں بھی انھوں نے اپنی صلاحیت کا لوہا منوا لیا۔ چوں کہ وہ کشمیری تھیں لہٰذا ان کی شاعری میں پورے کشمیر کا سچ دکھائی دیتا ہے۔ ان کی شاعری میں کشمیر درشن کے ساتھ ساتھ وہاں کی خواتین کے مسائل بھی ایک جارحانہ انداز میں ملیں گے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ سماج کو آئینہ دکھانے کی کوشش کر رہی ہیں۔

دختر کشمیر کہی جانے والی ڈاکٹر ترنم ریاض 20 مئی 2021 کو مالک حقیقی سے جا ملیں۔ ان کے ادبی سرمائے پر تفصیلی تنقیدی و تحقیقی کام ہونا ابھی باقی ہے۔

○ **سعدیہ سلیم، عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد** ☆☆

عفت آرا





پروفیسر سیّد اقبال علی

فارسی نغمہ ''کوچہ خالی'' کا Audio جب اُنھوں نے مجھے Forward کیا تو میں کوچہ خالی، خانہ خالی، شہر خالی الفاظ کی تکرار کے زیر اثر دُنیا کی بے ثباتی پر غور کرتے ہوئے اُن کی ہم خیال ہوگئی۔ فلسفی Meaninglessness Of Existence کا بڑے غور وخوض کے بعد کس خوبی سے تذکرہ کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ Death is Ingrained in Life کا ذکر بھی کرتے ہیں۔ ہم موت سے ڈرتے ہیں اور اُس سے بچنے کے لئے اُسے ایک دور رس چیز سمجھتے ہیں۔ پھر تنازع بقاء میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ ہم اپنے ہم خیال لوگوں کے درمیان وقت گزارتے ہیں۔ لیکن ایک بلند مقام پر پہنچنے کے لئے خدا سے تعلق انسان کی ہر مایوسی اور غم کا خاتمہ کر دیتا ہے۔

اقبال علی کانپور کے دیہی علاقے میں پیدا ہوئے لیکن غربت وافلاس کے مہیب سائے اس طرح اُن کا احاطہ کرتے چلے گئے کہ وہ ایک خوشگوار اور بے فکری کی زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکے۔ والدہ جلد رحلت فرما گئیں۔ والد کی سخت گیر نگرانی، بھائی بہنوں سے اپنے حقوق حاصل کرنے کے لئے تصادم، عزیز واقارب اور اپنے گرد ونواح میں رہنے والوں کے ذریعے تذلیل نے اُنھیں نفسیاتی طور پر نازک مزاج اور انتقام جو بنا دیا۔ وہ دوسری جنگِ عظیم کے بعد بے روزگاری کے شکار باصلاحیت نوجوانوں کی طرح ایک Angry Man بن گئے جو ہر ایک سے شاکی اور غیر مطمئن رہتے تھے۔ اب اُن کے سامنے ایک بڑا Challenge یہ تھا تعلیم کے حصول کے ذریعے اتنے بااختیار واقتدار ہو جائیں کہ سب کو زیر کر لیں اور اپنے وجود کو باعثِ فخر بنائیں۔ اُنھوں نے ہر امتحان میں امتیازی نمبر حاصل کئے اور Scholarships کے حقدار بن کر تمام مشکل منزلیں بتدریج طے کر لیں۔ جرمنی جانے کا موقع فراہم ہوا تو اپنے وطن کے مسائل کو خیر باد کہہ کر ایک ایسے ملک کی طرف پا بہ رکاب ہوئے جہاں علم کے سمندر رواں تھے اور وہاں زندگی کی مشکلات کا مقابلہ کرنے کے باوجود حسبِ مرضی بہت سے پسندیدہ انتخابات موجود تھے جو آئندہ کامیابی حاصل کرنے کے ضامن تھے۔ اُنھوں نے وہاں رہ کر Environmental Engineering کا ایک کورس ختم کیا اور زبان وبیان کے مسئلے سے اُکتا کر یہ اندازہ لگایا کہ یورپ سے بھی زیادہ خوبصورت مواقع حاصل کرنے کی جگہ امریکہ ہے جو ہر لحاظ سے پُرکشش اور سودمند ثابت ہوگی۔

امریکہ ایک وسیع وعریض ملک ہے جو تقریباً پوری دُنیا کو اپنی گرفت میں لئے ہوئے ہے۔ وہاں بے شمار Universities ہیں جن کے معیار مختلف لیکن قابلِ رشک ہیں۔ ریسرچ کا کام دقت طلب ہے لیکن ایک ذہین اور حوصلہ مند انسان کو اُسے جاری رکھنا ضروری ہے تاکہ وہ اپنے لئے وسائل پیدا کرے اور ایک اطمینان بخش ملازمت حاصل کر سکے۔ اقبال علی نے Chemical Engineering میں Washington State University سے M.S. اور پھر Ph.D مکمّل کی اور کس طرح اس جدوجہد میں کامیاب ہوئے یہ اُن کے زرخیز ذہن اور مسلسل کوشش کا نتیجہ تھا۔ اُنھوں نے بیرونِ ملک میں مالی مشکلات کا سامنا کیا، زندگی کے سرد وگرم سے گزرے، لوگوں سے تعلقات اُستوار کئے جن میں ہندوستانی، پاکستانی اور Blacks کا اتحاد شامل تھا۔ پھر اپنے آپ کو Settle کرنے کی کوشش کی جس میں ناکام رہے۔ وہ ایک عرصے Industry میں کام کرتے رہے، تجربات حاصل کئے۔ نئی چیزوں کا انکشاف کیا اور اپنے مذہب اور تہذیب کی اہمیت کی فہم حاصل کی اور واپس اپنے ملک لوٹ آئے جہاں اُنھیں ایک بہتر مستقبل تلاش کرنے کی فکر تھی۔ وہ دلی، پونے اور جے پور میں ملازمت کرنے کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے منسلک ہوگئے۔ یہاں بھی Chemical Engineering Dept. سے اپنے Career کا آغاز کرنے کے بعد Environmental Engineering کے Civil Engineering Dept. شعبے میں بحیثیت پروفیسر مقرر ہوئے لیکن درس وتدریس سے زیادہ اُنھیں Administration کے کاموں سے دلچسپی تھی۔ یہ انتظامِ عملی کی صلاحیت اُن کے اندر خداداد تھی جس نے اُنھیں Boys Polytechnic کی Principalship کی طرف راغب کیا۔ جب یہ عہدہ اُنھوں نے حاصل کیا تو سرسیّد کی طرح جو طرزِ نو اور جدید طریقے امریکہ میں قیام کے دوران مختلف شکلوں میں اپنے اطراف پائے تھے اُن کو اس ادارے کی فلاح کے لئے استعمال کیا۔ اُنھوں نے Leather Technology اور Plastic Unit کو نہ صرف ایک نیا رنگ دیا بلکہ اُسے کامیاب بنایا۔ مجموعی طور پر تمام Courses اور Syllabus کا جائزہ لیا اور اُس میں ترمیم کی۔ طالب علموں کی ترقی کے لئے اساتذہ میں بیداری پیدا کی اور اپنا تمام وقت اس ادارے میں صرف کر کے دوسروں کو بھی کارگزار بنایا۔ اُنھوں نے Polytechnic کو حیرت انگیز طور پر ایک

'گلفشاں' اللہ والی کوٹھی، دودھ پور، سول لائنس، علی گڑھ۔ 202002
فون: 9759999868

مثالی ادارہ بنادیا۔

اُنھیں ریٹائر ہونے کے بعد علی گڑھ کی محدود زندگی گراں گزرنے لگی۔اُن کی سیمابی طبیعت ہمیشہ اُنھیں بے چین رکھتی تھی۔اب اس یکسانیت سے فرار کے لئے اُنھوں نے Ethiopia جانے کا فیصلہ کیا جہاں پروفیسر کی حیثیت سے اُنھوں نے دوسال کام کیا اور اُن لوگوں کو قابلِ قبول پایا۔یہ ملک آب وہوا کے لحاظ سے اچھا معلوم ہوا لیکن قیام و طعام کا انتظام نہایت ناقص تھا۔تعلیم کا معیار بھی پست تھا اگرچہ وہاں بے حد Qualified لوگوں کا تقرر ہی ممکن تھا۔اُنھیں Islamic History سے دلچسپی تھی اسی سبب وہاں مختلف تاریخی مقامات کی سیر کی اور تُرکی طرزِ تعمیر کو عمارتوں میں نمایاں طور پر قابلِ دید پایا۔عربی اور عربوں کی تہذیب کے اثرات بھی جابجا موجود ہیں۔عیسائی حد سے زیادہ آزاد خیال اور مسلمان شریعت کے پابند ہیں۔سب سے مل کر اُن کے درمیان رہ کر پریشانیوں میں بھی اُنھوں نے خوشی حاصل کی اور اپنی معلومات میں اضافہ کیا۔

میں نے اُن کے ہمراہ امریکہ کا سفر طے کیا اور ہم اپنے بیٹے یوسف کی Commencement Ceremony میں شریک ہوئے کیونکہ اُس نے وہاں کی معروف Johns Hopkins University سے M.S. کی ڈگری حاصل کی اور پھر Bio-Medical Engineering کے شعبے میں Ph.D میں داخلہ لے کر تعلیم کے سلسلے کو جاری رکھا۔امریکہ میں قیام کے دوران خوبصورت مقامات کی سیر کی، وہاں کا University Campus تعلیم وتدریس کا بہترین نمونہ ہے۔لوگ مصروفِ مطالعہ رہتے ہیں اور دوسروں کے معاملات میں مداخلت نہیں کرتے۔ ہر جگہ نظم وانتظام اور تہذیب پائی جاتی ہے۔فطرت کے مناظر کی فراوانی کے علاوہ دل بہلانے کے مختلف ذریعے ہیں۔افغانی اور ترکی Restaurants میں انواع واقسام کے کھانے بڑے دلکش معلوم ہوئے۔ یہ ملک مشینی دور کا سب سے اچھا نمونہ ہے۔ Theatres, Museums, Libraries, Parks, Book Stores, Art Galleries, Seaside, Churches اور Malls چیزوں سے آراستہ ہیں۔کاریں ہر وقت سڑکوں پر رواں رہتی ہیں اور Rules Of The Road کے سب پابند ہیں۔ہم اقبال علی کے پُرانے شناساؤں سے ملے وہ سب ایک آسودہ لیکن مصروف زندگی گزارتے ہیں۔ ہم لوگ حج کا فریضہ ادا کرنے والے تھے اور تمام منصوبے مکمّل تھے لیکن COVID-19 کی آمد نے اس سعادت سے ہمیں محروم کردیا۔

ہندوستان واپس آکر اقبال علی پھر جہاں بین ہونے کی خواہش میں مبتلا ہوگئے۔ وہ Central Asia کا سفر کرنا چاہتے تھے لیکن فی الحال تمام ذرائع منسوخ کردیئے گئے تھے اور لوگ Corona Virus کے تہلکہ سے خوف زدہ تھے۔اقبال علی کی شخصیت کے دو حصّے تھے ایک اُن کا Public Self دوسرا Private Self ایک رُخ اُنھیں تعلیم یافتہ لوگوں کے درمیان وقت گزارنے اور اپنی Bookish Knowledge کے ذریعے تبادلۂ خیالات کرنے پر اُکساتا تھا۔اپنے مضمون کے علاوہ اُنھیں معاشیات، سیاسیات، تاریخ اور کسی حد تک ادب سے دلچسپی تھی۔وہ رسائل، کتابوں اور Inter Net کے توسط سے اپنی معلومات میں اضافہ کرتے رہتے تھے۔ اُن کا دوسرا رُخ اُنھیں دیہات میں بسنے والوں اور اُن کی زندگی کے پیچ وخم میں اُلجھائے رکھتا تھا۔وہ اُن کے درمیان رہ کر بڑی راحت محسوس کرتے تھے۔وہ ایک کنبہ پرور انسان تھے، اسی سبب اپنے قرابت داروں اور ہم وطنوں کو یونیورسٹی میں ملازمت دلوا کر یہاں اُن کا ایک جال پھیلا دیا اور اُن کی زندگی کو آسودہ بنانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ وہ ایک ذہین آدمی تھے اور اپنے نفع ونقصان پر نظر رکھتے تھے لیکن Emotional Intelligence کا اُن کے یہاں گزر نہیں تھا، اس لئے دوسروں کو سخت وسست باتیں سنا کر اُس کا ردِّعمل محسوس کرنے سے وہ قاصر تھے۔وہ عورت کو کم درجہ خیال کرتے تھے لیکن اُن کی تعلیم کے حامی تھے۔اُنھوں نے زروزمین جمع کرکے ایک ایسی شے کو اُجاگر کیا جسے Avarice یا طمع کہتے ہیں۔اس کی کمی نے اُنھیں دوسروں کا اسیر بنایا تھا۔اس کی زیادتی نے اُس کے بے شمار خواہش مند پیدا کردیئے جو اُن کے رخصت ہوتے ہی سرگرم ہوگئے۔ میں اور میرا بیٹا اس ناپسندیدہ منظر کے تماشہ بین ہیں۔ اُنھوں نے ان تمام تفصیلات سے نہ تو ہمیں کبھی آگاہ کیا اور نہ ہم نے اس کی تمنّا کی۔میرے گھر میں مجھے روپے سے زیادہ حصولِ علم کا درس ملا تھا اور میں ان فکروں سے ہمیشہ آزاد رہی۔

میں نے اقبال علی کو ایک شیشے کے وجود کی طرح بڑی حفاظت سے رکھا لیکن جب وہ یہاں سے گئے تو ذرا سی ضرب لگنے سے ایسے پاش پاش ہوئے کہ اُنھیں کوئی یکجا نہ کرسکا۔ مجھے بڑا زعم تھا کہ میں اُن کی دل وجان سے نگہداشت کرتی ہوں، وہ ضرور لمبی عمر پائیں گے اور تندرست رہیں گے۔لیکن اللہ تعالیٰ کے فیصلے کے آگے انسان سرِتسلیم خم کرتا ہے۔میں نے ہمیشہ کی طرح اُن کی آمد سے پہلے تمام چیزیں درست کیں اُن کی پسند کے کھانے پینے کا سامان یکجا کیا لیکن وہ اتنی جلدی رُخصت ہوگئے کہ اُن سے وابستہ تمام چیزیں نوحہ خواں ہیں کہ وہ کہاں چلے گئے اور میں یادوں کے گرداب میں گرفتار ہوں بے دست وپا۔اب میں اپنی بہن کے ہمراہ یہ زندگی کے چند اور لمحے گزاردوں گی اُن کے ہمدردانہ اور دانش مندی کے مشوروں کے ساتھ کیونکہ ہم دونوں نے ہمیشہ مل کر مسائل کے حل تلاش کئے۔اقبال علی کی آخری رسوم اُن کے آبائی وطن اور اُن کے عزیز گاؤں میں ادا ہوئیں اور وہ اُن لہلہاتے کھیتوں کے محافظ بن کر ہمیشہ کے لئے اُسی زمین میں مدفون ہوگئے۔ جہاں سے اُنھوں نے اپنی زندگی کا آغاز کیا تھا۔وہ اس آزادانہ ماحول کے شیدائی تھے جس میں رہ کر اُنھوں نے تمام فیصلے خود کئے تھے۔غالب اُن کے محبوب شاعر تھے اور وہ بسا اوقات اُن کے مشکل اشعار کا تجزیہ اپنی ذہانت اور شعور سے کرتے تھے۔ اسی سبب غالب کے اس شعر پر اس مضمون کا اختتام کرتی ہوں:

بازیچۂ اطفال ہے دُنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشہ مرے آگے

☆☆☆

رسالہ سے متعلق شکایتیں/ استفسار بزنس شعبہ کے نام

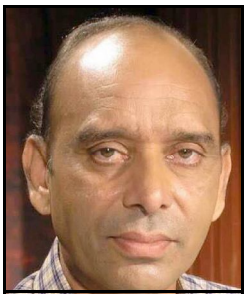
pdjucir@gmail.com

پر ای میل کریں اور اس کی کاپی ایڈیٹر آج کل کو

ajkalurdu@gmail.com

پر ارسال کریں۔

ڈاکٹر اعجاز پاپولر میرٹھی



کڑوی روٹی

فکر دنیا میں سر کھپاتا ہوں
میں کہاں اور یہ وبال کہاں

شبیر احمد بھنڈی کی پوری زندگی غالب کے اس شعر سے عبارت ہے۔ شبیر احمد بھنڈی انور احمد گیندہ کی پانچویں بیوی کی چھٹی اولاد تھے۔ اپنے بھائیوں سے کسی بات پر ناراض ہوکر آپ اپنے ماموں سلطان احمد صندوق والا کے گھر بھوپا چلے آئے تھے۔ لوگ کہتے ہیں کبھی شبیر احمد بھنڈی کے ماموں سلطان احمد صندوق والا بھی ممبئی میں فلموں میں اداکاری کرنا چاہتے تھے۔ وہ بھی اپنے والد استاد نظیر احمد بلو سے لڑ جھگڑ کر ممبئی چلے آئے تھے۔ بدقسمتی سے دسیوں سال ممبئی میں آوارہ گردی کرنے کے بعد انہیں غریبوں کے امیتابھ، متھن چکرورتی کی ایک معمولی سی فلم میں ایک منٹ کا رول مل گیا تھا۔ وہ ایک منٹ کا رول سلطان احمد صندوق والا کی زندگی کا بیحد قیمتی سرمایہ تھا۔ جس کے سہارے وہ اپنی بچی کھچی زندگی کے دن گزار رہے تھے۔ ان کے گھر میں متھن چکرورتی کی بڑی بڑی تصاویر آویزاں تھیں۔ شبیر احمد بھنڈی کو یہ سب کچھ پسند نہیں تھا۔ وہ اپنے ماموں سلطان صندوق والا کو اس خواب غفلت سے نکال کر حقیقت سے روشناس کرانا چاہتے تھے۔ لیکن ماموں سلطان احمد صندوق والا کی آنکھوں پر تو ناسمجھی کی پٹی بندھی ہوئی تھی۔ وہ کسی بھی صورت میں ماننے کو تیار نہیں تھے۔ الٹا ماموں سلطان احمد صندوق والا نے انہیں ہی اپنا الگ انتظام کرنے کو کہا اور ساتھ میں یہ بھی کہا مجھے کئی پہلوانوں کے کھانے والا پیٹو شبیر احمد بھنڈی نہیں چاہیے ہاں صرف تم میرے گھر میں سو سکتے ہو سمجھے۔ تبھی شبیر احمد بھنڈی نے عہد کیا کہ وہ اب اپنے ماموں سلطان احمد صندوق والا کے گھر کھانا نہیں کھائیں گے۔ وہ پڑھے لکھے ہیں، وہ اب محنت کریں گے۔ ایسا سوچتے ہوئے شبیر احمد بھنڈی بھوک کے عالم میں ماموں کے گھر کے باہر آکر اپنی تقدیر کو کوس ہی رہے تھے۔ کیا دیکھتے ہیں سامنے کلن ٹھیکیدار کا جنازہ کسی قبرستان کی طرف جا رہا تھا۔ شبیر احمد بھنڈی بھی اس جنازے کے پیچھے چل پڑے۔ تدفین کے بعد کلن ٹھیکیدار کے گھر آکر کڑوی روٹی میں شرکت کی۔ بہت مزے لے لے کر کھانا کھایا۔ کلن ٹھیکیدار کے لڑکوں سے گوشت کی تعریف کی اور یہ بھی کہا آئندہ جب کبھی گھر میں کوئی عین غین ہو جائے تو کھانا لڈن باورچی سے ہی بنوانا۔ کیا غضب کا کھانا بناتا ہے، لگتا ہی نہیں کہ یہ کڑوا کھانا ہے۔

اس کھانے کے بعد تو شبیر احمد بھنڈی کو ایک امید کی کرن نظر آئی۔ انہوں نے شہر کے دسیوں قبرستانوں کے گورکنوں سے ملاقات کی اور ان سے ان کا موبائل نمبر بھی حاصل کیا۔ اس سے شبیر احمد بھنڈی کو یہ فائدہ ہوا کہ اب انہیں جگہ جگہ جا کر کسی کے انتقال کی جانکاری حاصل کرنے کی کوئی ضرورت نہ رہی بلکہ اب تو روز ہی کسی نہ کسی گورکن کے فون کی گھنٹی بجتی شبیر احمد بھنڈی بھی ان مرنے والوں میں انتخاب کر کے اپنے حساب سے طے کرتے کہ انہیں کس کی کڑوی روٹی میں شرکت کرنی ہے۔ ایک دن شبیر احمد بھنڈی کو کڑوی روٹی کھاتے کھاتے خیال آیا کیوں نہ اس لاک ڈاؤن میں کسی غیر مسلم کی شادی میں جا کر مختلف انواع واقسام کے کھانے کھائے جائیں اور زندگی کا لطف اٹھایا جائے۔ بس یہی سوچ کر مٹک لال مٹکو کے لڑکے کی شادی میں گگن میرج کے ہال میں پہنچ گئے۔ خوب ڈٹ کر کھانا کھایا۔ لڑکے والوں نے شبیر احمد بھنڈی کو گھیر لیا اور ان سے پوچھا آپ براتی ہیں یا گھراتی۔ اتنا سن کر شبیر احمد بھنڈی نے بڑے اطمینان سے انہیں جواب دیا نہ تو میں براتی ہوں اور نہ ہی گھراتی بلکہ میں اس شادی میں سرکار کی طرف سے یہ دیکھنے آیا ہوں کہ آپ لوگ کورونا وائرس کی اس مہاماری میں کورونا گائڈ لائن کو فلو کر رہے ہیں یا نہیں۔ کہیں مہمانوں کی سنکھیا 100 سے زیادہ تو نہیں ہوگئی ہے۔ سرکار کو مجھے رپورٹ بھی تو بھیجنی ہے پھر تو شبیر احمد بھنڈی کی بڑی آؤ بھگت ہوئی۔ بہت سے انعام واکرام دے کر رخصت کیا گیا۔

شبیر احمد بھنڈی اپنے شہر کی ادبی محفلوں میں بھی بڑ چڑھ کر حصہ لیا کرتے تھے۔ شہر کے کالج اور یونیورسٹی میں جو بھی ادبی سمینار ہوتے تھے سلطان لیٹو شبیر احمد بھنڈی کو پروگرام کی بروقت اطلاع دیتے تھے۔ ان ادبی سمیناروں کی صدارت بھی وہ لوگ کیا کرتے تھے جو اردو ادب کی الف سے بھی واقف نہیں تھے۔ آج غالب سمینار کی صدارت رضوان بھٹی کر رہے تھے۔ پیسے والے بھی خوب تھے۔ اچھا خاصا پیسہ بھی صدارت کے لئے صاحب پروگرام کو دیا تھا۔ آخر میں صدر محترم رضوان بھٹی کی تقریر بھی ہونی تھی۔ شعبہ کے صدر اشرف مرچی نے رضوان بھٹی کو مائک پر آنے کی دعوت دی اور کہا اب ہمارے صدرِ محترم رضوان بھٹی پروگرام کی افادیت پر روشنی ڈالیں

333 نظام کاٹیج محلّہ کرم علی، میرٹھ، یوپی
popularmeeruthi@gmail.com

گے۔اسی وقت رضوان بھٹی اپنی سیٹ سے کھڑے ہوئے اور ہال کے چاروں طرف کی بتی (لائٹ) آن کر کے کہا آپ سب بہن بھائیوں کو لیٹ (light) برابر مل رہی ہے نا زوردار تھالیاں بجاویں پھر مائک پر آ کر کہا حجرات (حضرات) اک سیر سنا ریا ہوں۔

ایک سینساہ (شہنشاہ) نے بنوا کے حسیں تاز محل (تاج محل)
ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مجاق (مذاق)

یہ جو گالب (غالب) کا بڑا زلسہ (جلسہ) ہو رہا ہے مجھے وسیمیں (اس میں) آ کے بڑا مجا (مزا) آیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ آج اپنے فیمیر یٹ ساعر (فیوریٹ شاعر) زناب گالب (جناب غالب) سے ملاقات جرور (ضرور) ہوگی۔ افسوس بڑا افسوس ہوا آج بھی اپنے دوست گالب سے ملاقات نہ ہوسکی۔ تبھی رضوان بھٹی سے ڈپارٹمنٹ کے صدرِ محترم اشرف مرچی نے مائیک لے کر سامعین سے کہا:

ہم اس سمینار کے لئے بہت سی ادبی انجمنوں اور اکادمیوں سے مختلف اردو کے اداروں سے اور کچھ اردو سے نابلد لوگوں سے اردو کے سمیناروں کے لئے خاصی رقم وصول کرتے ہیں۔ رضوان بھٹی بھی ایک بڑی رقم دے کر ہمارے پروگرام کی صدارت کرتے ہیں اور اس پیسے سے ہم مختلف اقسام کے کھانے بنواتے ہیں اور اپنے سامعین کے ہر ذائقے کا خیال بھی رکھتے ہیں اور ہم اپنے ادبی سمیناروں میں یہ بھی دیکھتے ہیں کہ اردو ادب سے ہمارے سامعین کو کتنی دلچسپی ہے۔ یہ ہمیں ادبی پروگرام کرنے پر پتہ چلتا ہے۔ جب پروگرام شروع ہوتا ہے، سامعین کی تعداد بہت ہی مختصر ہوتی ہے لیکن پروگرام کے اختتام کے وقت سامعین کی تعداد میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ کبھی کبھی دو دیگیں بھی ناکافی ہو جاتی ہیں پھر بھی ہم شکر گزار ہیں جناب شبیر احمد بھنڈی کے جو غالب سمینار سننے کے بجائے کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے کئی بار وہ ہمیں سمینار کے بیچ میں آ آ کر بتاتے رہے ہیں۔ سچ میں ہم اگر سمینار کو کچھ دیر اور چلاتے تو یقیناً ہمارا کھانا ٹھنڈا ہو چکا ہوتا۔ انشاء اللہ آئندہ بھی ہم ان اردو ادب سے نابلد لوگوں کی ایک بڑی میٹنگ رکھیں گے اور جو لوگ جلسوں اور سمیناروں کی صدارت کرتے ہیں ان میں کتنی صلاحیتیں ہوتی ہیں اس بات کا اندازہ آپ کو رضوان بھٹی کی تقریر سے بھی ہو گیا ہوگا اور ہم آئندہ بھی اپنے ان ادبی سمیناروں کی صدارت رضوان بھٹی جیسے بڑے پیسے والے لوگوں سے ہی کرائیں گے اور اپنے ان ادبی سمیناروں میں کسی پڑھے لکھے انسان کو اب کبھی نہیں بلائیں گے۔ وہ اکثر پروگراموں میں آ کر مین میخ نکالتے ہیں، جو ہمیں قطعی پسند نہیں ہے۔ اشرف مرچی کی تقریر سن کر جلسے کے سبھی شرکاء کے ساتھ شبیر احمد بھنڈی نے بھی بہ آواز بلند کہا ہم سب آپ کی تائید کرتے ہیں۔

پھر اس کے بعد جلسہ اختتام پذیر ہوا پھر صدر شعبہ اشرف مرچی نے سب کو کھانے کی دعوت دی اور آئندہ بھی بہت لذیذ کھانے بنوانے کے لیے کہا۔ شبیر احمد بھنڈی نے زوردار تالیاں بجا کر ایک بار پھر اشرف مرچی کے بیان کی تائید کی۔ پھر سلطان لپیٹو نے اشرف مرچی کی تعریف کی اور کہا کہ آپ ان ادبی سمیناروں میں جو کھانے بنواتے ہیں وہ بہت ہی لذیذ ہوتے ہیں۔ اللہ سلامت رکھے آپ کو بس اسی بہانے ہماری ان ادبی پروگراموں میں حاضری ہو جاتی ہے۔ ورنہ ادب سے ہمارا کیا واسطہ پھر اس کے بعد شبیر احمد بھنڈی نے بھی اپنے گھر کی راہ لی۔ دوسرے دن دلّی والے شرف الدین شرفو کے چہلم کا کھانا تھا۔ اب شبیر احمد بھنڈی نے ایک ڈائری بھی بنالی تھی ۔کل شرف الدین شرفو کے گھر پرسوں غفران چودھری کا چہلم، شجاع الدین تیل والے کا چہلم، سلیم بیڑی کے گھر کی مجلس۔ غرض یہ کہ ایک ہفتے کے پروگرام شبیر احمد بھنڈی کی ڈائری میں موجود تھے۔ بس اسی طرح شبیر احمد بھنڈی کے شب و روز گزر رہے تھے۔ ارشاد احمد ڈھولچی کے گھر کی بریانی نے شبیر احمد بھنڈی کو وہ ناکوں چنے چبوائے نہ تو ان کا پیٹ قابو میں آیا اور نہ ہی گلے کی خراش گئی بہت مشکل میں جان تھی۔ شبیر احمد بھنڈی کی ادھر ارشاد احمد ڈھولچی کے گھر کے پندرہ لوگوں کی رپورٹ پازیٹو آ گئی تھی اور ساتھ میں شبیر احمد بھنڈی کی رپورٹ بھی پازیٹو آنے پر انہیں بھی کورنٹین ہونا پڑا اس دوران کتنے ہی گورکنوں کے۔ کتنی ہی مجلسوں کے، کتنے ہی چہلموں کے فون آئے پر شبیر احمد بھنڈی ایک بھی فون نہ اٹھا سکے اور وہ کس پریشانی میں مبتلا ہیں یہ بھی کسی کو نہ بتا پائے بس ان کا موبائل بجتا رہا اور کسی ایک بھی فون کا انہوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ ہر فون پر ارشاد احمد ڈھولچی کو کوستے رہے تیرا ستیاناس ہو کمینے اللہ ہی سمجھے گا تجھے ارشاد احمد ڈھولچی؟

ادھر شبیر احمد بھنڈی کے سرکاری اسپتال میں پندرہ دن کس مصیبت اور پریشانی میں گزرے ہر ہر پل موت کو اپنے سامنے کھڑے پایا اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد کورونا وائرس ٹیسٹوں سے بھی گزرنا پڑا۔ ان پندرہ دن میں کتنے ہی لوگوں کو شبیر احمد بھنڈی نے مرتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ ہر طرف خوف و ہراس کا ماحول شبیر احمد بھنڈی کے بیڈ کے برابر میں ہی لالہ کیدار ناتھ کا بیڈ تھا۔ اچھے پیسے والے تھے۔ کورونا وائرس کی تیسری لہر کی اس افراتفری میں کچھ لوگ انہیں بھی پرائیویٹ نرسنگ ہوم لے جانے کے بجائے سرکاری اسپتال میں چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ ادھر شبیر احمد بھنڈی نے ان پندرہ دنوں میں اپنے پرائے کا فرق بھی سمجھ لیا تھا۔ آج گڑگڑا کر اپنے رب سے رو رو کر دعا مانگی ہے میرے رب کریم میری خطاؤں کو بخش دے اس پریشانی اور مصیبت سے مجھے اب نجات دے دے۔ میں پڑھا لکھا ہو کر بھی کس طرح کے کام کر رہا تھا۔ میں اب محنت کروں گا اور اپنی عزت نفس کو اب کبھی مجروح نہ ہونے دوں گا جو بنا محنت کئے حاصل ہو ایسی روزی سے اب اجتناب کروں گا۔ شبیر احمد بھنڈی کو دعا مانگتے ہوئے لالہ کیدار ناتھ بہت غور سے دیکھ اور سن رہے تھے۔ ان پندرہ دنوں میں شبیر احمد بھنڈی نے ان کا اسپتال میں بہت خیال رکھا تھا جہاں اپنے لوگ انہیں بے یار و مددگار چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ ایسے وقت میں خونی رشتے بھی بے معنیٰ ہو کر رہ گئے تھے۔ ان نامساعد حالات میں شبیر احمد بھنڈی کا دم غنیمت تھا جو مذہب و ملت سے اوپر اٹھ کر انسانیت کی خدمت کر رہا تھا۔ کیدار ناتھ نے اپنے بیڈ سے اٹھ کر شبیر احمد بھنڈی کی آنکھوں سے آنسو پونچھے اور کہا اب شبیر فکر کی کوئی بات نہیں۔ تمہارا بڑا بھائی کیدار ناتھ ایشور کی کرپا سے اس وائرس سے اب بچ گیا ہے اور تم پر بھی پربھو کی کرپا رہی آج ہم دونوں ٹھیک ہو کر اسپتال سے اپنے اپنے گھر جا رہے ہیں۔ شبیر تم نے میرا دل جیت لیا ہے۔ سمجھو اب تمہارے غم کے بادل بھی چھٹ چکے ہیں۔ یہ میرا وزیٹنگ کارڈ ہے۔ میرے پاس ایک منیجر کی پوسٹ خالی ہے تم کل ہی جوائن کر سکتے ہو۔ لالہ کیدار ناتھ جی کے اتنا کہتے ہی شبیر احمد بھنڈی کی آنکھوں سے خوشی کی گنگا بہہ نکلی۔

☆☆☆

وحشی سعید



تلاش

سورج سر پر آ گیا، لیکن وہ بوڑھا، ضعیف، ریش دراز آدمی اب بھی عبادت میں محو ایسے ہی آنکھیں موندے ہوئے تھا، جیسے وہ چھ گھنٹے پہلے تھا۔ وہ دونوں زانو میں سر ڈالے ہوئے اُس کے سامنے تھے۔ اُن دونوں کا انداز ایسا تھا جیسے وہ اپنے متعلق فیصلے کا انتظار کر رہے ہوں۔ ماحول کی سحر انگیزی نے اُن دونوں کو بت بنا کے چھوڑا تھا۔ اُن میں ایک قد کا دراز تھا۔ اُس کی آواز میں مٹھاس تھی اور گفتار میں جادو کا اثر۔ وہ اپنے آپ کو شیر دل کہتا تھا، کیونکہ وہ اپنے ہر غلط یا صحیح فیصلے پر اُسی طرح اٹل رہتا تھا جیسے پتھر کی لکیر۔ دوسرا نوجوان قد کا چھوٹا تھا۔ وہ اپنے آپ کو اکھاڑے کا شیر نہیں سمجھتا تھا، بلکہ اس کے برعکس وہ اپنے آپ کو فہم وادراک کا خزانہ سمجھتا تھا۔ اس لئے یار دوستوں نے اُس کو مفکر کا نام عطا کیا تھا۔

جب سورج ڈھلنے لگا۔ آنے والے اندھیرے میں ضعیف ریش دراز آدمی نے اُن دونوں کے سامنے سکہ پھینکا۔ دونوں سکے پر جھپٹ پڑے، لیکن شیر دل فولادی بازو، پہلوانی جسم اور چٹان کی طرح مضبوطی رکھتا تھا۔ اس لئے اُس نے فوراً سکہ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ بعد میں جب دن کے اُجالے میں اُس کو معلوم ہوا کہ سکہ کھوٹا ہے، اُس نے غصے میں آ کر بوڑھے ریش دراز آدمی کی لعنت ملامت کرنی شروع کی اور غصے کی انتہا میں سکے کو پھینکنے ہی والا تھا کہ مفکر نے اُس کا ہاتھ پکڑا اور کہا :

''کبھی کبھی برے وقت میں کھوٹا سکہ بھی کام آ جاتا ہے''۔

ہوٹل شہنشاہ پیلس، بلیوارڈ، سرینگر۔190001 (کشمیر)
nagina968@gmail.com
فون:9419012800

اب تو قلعے تک پہنچنے کے لئے دونوں نے مہم کا آغاز کیا۔ حالانکہ قلعے تک کیسے پہنچا جائے اور وہاں کن کن دشوار گزار راستوں سے گزرنا ہوگا، اس سے وہ دونوں بے خبر تھے۔ وہ انجام سے بھی بے خبر تھے، مگر ولولہ، جذبہ اور جوش اُن کی رگوں میں خون بن کر دوڑ رہا تھا۔ شیر دل نے کھوٹے سکے کو تصویر بنا کر اپنے گلے میں آویزاں کیا۔

پھر سفر میں کچھ ایسے مقامات بھی آئے جہاں انسانوں کو نیزوں پر اُچھالا جا رہا تھا۔ شیر دل کے جذبات مجروح ہو گئے۔ اُس سے یہ منظر دیکھا نہ جا سکا۔ اُس نے اپنی سحر بیانی کو مفکر کے مقولوں سے سجایا اور سنوارا۔ پھر اس بستی میں قہر نے سب کو اپنے ساتھ بہا ڈالا۔

شیر دل اپنے قبیلے کا سردار بن کے اُبھرا۔ لوگوں کے دلوں میں شیر دل کو جب عزت کا مقام ملا، تو اونچی خانقاہوں میں بیٹھا ہوا بوڑھا پیشوا غضب ناک ہو گیا۔ اُس نے اپنے فوجی دستے کی مدد سے شیر دل کو گرفتار کرا کے خانقاہ میں اپنے سامنے پیش کرایا۔ بوڑھے پیشوا کی شہادت والی انگلی حرکت میں آ گئی، تو شیر دل کو تختۂ دار کی طرف لے جایا گیا۔ لیکن کھوٹا سکہ کھوٹا تھا۔ وقت پر کام آ گیا۔ نہ صرف شیر دل کی جان بچائی بلکہ اُن کے سب سے بڑے دیوتا کا منصب بھی عطا کروایا۔

کل تک وہ ایک ادنیٰ فرد تھا جو گمنامی کی دنیا میں ایسے بھٹک رہا تھا جیسے ایک دیوانہ اپنی دیوانگی کے عالم میں اکیلے سفر کر رہا ہو۔ لیکن آج منصب شاہی نے اُس کی ہر ادا کو ایک انوکھا، نرالا اور دل فریب انداز بخش دیا۔ اب جب بھی وہ آئینے کے سامنے اپنے سر پر تاج رکھتا تھا تو آئینے سے کہتا تھا :

''میں ..... میرا سر.....اور میرا تاج!''

اب رقاصہ کا رقص شروع ہوا۔ اُس کے بدن کا انگ انگ تھرکنے لگا۔ شہنشاہ اُس کی ہر ادا پر فریفتہ ہو رہا تھا۔ فریفتگی نے جب دیوانگی کا رنگ اختیار کرنا شروع کیا تو مفکر نے ٹوکتے ہوئے کہا :

''اسے چھوا تو جا سکتا ہے لیکن چکھا نہیں جا سکتا''

لیکن رقاصہ تو رقاصہ تھی۔ وہ دعوت عیش کو بام عروج پر پہنچانے کا ہنر خوب جانتی تھی۔ وہ اپنا ہر قدم ناپ تول کے آگے بڑھا رہی تھی۔ پہلے پہل اُس نے اپنی کالی کالی آنکھوں کو الماس کی طشتری میں سلیقے سے پیش کر کے شہنشاہ کو اپنے تخت پر کھڑا کیا، لیکن بوڑھا پیشوا، اپنے آباؤ اجداد کی روایت کو توڑنا نہیں چاہتا تھا بلکہ اُن کو اور مضبوط کرنا چاہتا تھا، اس لئے اُس نے شہنشاہ کے حضور میں دوزانو ہو کر اپنے عصا کو تھامتے ہوئے نہایت عاجزانہ آواز میں کہا :

''ہمارے آقا! ہمیں ایسی آزمائش میں نہ ڈالئے، جہاں ہمارا صبر جواب دے جائے۔ ہماری عزت ہمیں للکارتی رہے گی۔ ہمارے آقا! ہم سے ہماری اولادوں کی قربانی مانگئے، جائدادیں مانگئے، ایمان مانگئے، لیکن ایسا فیصلہ نہ سنایئے جس سے قہر نازل ہو جائے''

شیر دل آئینے کے سامنے اپنے تاج کے جھالروں کو ترتیب دے رہا تھا، لیکن مفکر فکر اور پریشانی میں ڈوبا ہوا تھا۔ شیر دل مفکر کی بزدلی پر زیر لب ہنس رہا تھا۔ اب مفکر سے نہ رہا گیا۔ اُس نے کہا :

''مانا کہ تم دیوتا بنے ہو، لیکن تم انسان ہو۔ ہزاروں خواہشات ہیں تمہاری، لیکن ایسی خواہشات کا اظہار ہی کیا کرنا جو ہمارے ہی وجود کو ڈس لے''

لیکن رقاصہ کے پاؤں اب بھی فرش پر تھرک رہے تھے۔ نہ جانے وہ حسن کا جادو تھا یا رقاصہ کا فن، کہ وہ بلندیوں کو چھونے لگی۔ اُس نے اپنے گلاب جیسی پنکھڑیوں والے ہونٹوں کو نئے نئے زاویے اور موڑ دیے۔

شہنشاہ دیکھتا رہ گیا۔ ایسے ہونٹ صرف پوجنے کے لئے ہوتے ہیں، چکھنے کے لئے نہیں۔ لیکن وہ اپنی اُبھرتی ہوئی خواہش کو سلا دینے والا صالح کہاں! اس لئے شہنشاہ اپنے روئے شریف سے گستاخ مکھی کو ہٹاتے ہوئے مفکر سے کہنے لگا :

''ہم تو غلام ہیں روایات کے۔ روایت کو توڑنا ہمارے بس کی بات نہیں۔ وقتوں سے چلا آرہا ہے خاندان کا تصور! اس تصور سے فرار ناممکن ہے اور روایت سے انحراف کرنا دراصل خود کو نیست و نابود کرنے کے مترادف ہوگا''

مفکر پہلی بار شیر دل کے سامنے تن کر کھڑا ہوا۔ اپنی دھیمی مگر فیصلہ کن آواز میں کہنے لگا :

''تلواروں کی نوک کب روایت کو برقرار رکھتی ہے۔ فہم و ادراک یہی کہتا ہے کہ ہمیں بدلتے ہوئے وقت کے تیور پہچان لینے چاہئیں، ورنہ بہتے دریا میں آیا ہوا طوفان اپنے ساتھ سب کچھ بہا کے لے جاتا ہے میرے دوست .....!''

شیر دل کے ماتھے پر ناگواری کی شکنیں اُبھر آئیں :

''میں تمہارا دوست نہیں ہوں۔ میں تمہارا شہنشاہ ہوں۔ میرا اور تمہارا رشتہ ایک شہنشاہ اور مشیر کا رشتہ ہے''

مفکر گہری سوچ میں اس لئے نہیں پڑا کہ اُس کو دوستی کے کھو جانے کا غم تھا۔ ہاں، دوست کے ڈوب جانے کا غم ضرور تھا۔ یہ سانحہ کیا کم تھا کہ جس دوست کو وہ ہر سرد و گرم سے بچاتا رہا، وہ آج اُس کی چھایا بھی نہ بن سکا۔

اب رقاصہ بھی رقص میں محو اپنے آپ سے بے خبر ہوگئی۔ اُس کے بدن کے تمام حصے تھرکنے مٹکنے لگے۔ وہ مستی کو ہر رنگ میں پیش کرنے لگی۔ ایسا ہی منظر ہوش کو آگ لگا دیتا ہے۔ شہنشاہ سے اب رہا نہ گیا۔ وہ اپنی آواز میں پہلے والی گرج اور سحر بیانی پیدا کرنے کی کوشش کرنے لگا، جس کو وہ اپنا سب سے قیمتی اثاثہ سمجھتا تھا۔ لیکن وہ سحر بیانی اب کہاں؟ شیرینی اب کہاں؟

وہ بوڑھے پیشوا سے کہنے لگا :

''پیشوا! .....سن! میں نہیں چاہتا کہ میری موت کے بعد میری قوم صدیوں خون کے آنسو بہاتی رہے اور شہر شہر، گاؤں گاؤں اپنے دیوتا کی تلاش میں بھٹکتی رہے۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ صدیوں سے چلی آرہی روایت کو توڑ کر ایک نئی روایت کی داغ بیل ڈال دوں۔ اس لئے میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ میرے جانے سے پہلے تمہارے لئے ایک دیوتا چھوڑتا جاؤں۔ اس لئے یہ امر اب ضروری بن جاتا ہے کہ ہماری ایک ملکہ ہونی چاہئے۔ پیشوا! جس لڑکی کا ہم نے انتخاب کیا ہے، وہ ہماری ملکہ بنے گی''

پیشوا کے ہاتھوں سے عصا گر گیا۔ وہ اپنی کانپتی ہوئی بوڑھی آواز میں کہنے لگا :

''لیکن شہنشاہ عالی! جب سے ہماری تہذیب وجود میں آئی ہے، تب سے دیوتاؤں کی شادیاں آسمانوں میں ہوتی چلی آرہی ہیں.....!''

شہنشاہ اپنے تخت پر کھڑے ہو کر طیش میں آکر کہنے لگا :

''پیشوا!.....میں تمہارا شہنشاہ ہوں اور میرا ہر حکم بجالانا تمہارا ایمان ہے''

پیشوا نے لڑکی سے کہا :

''بدقسمت! .....اب تمہاری قربانی کا وقت آگیا ہے''

اس کا یہ جملہ سن کر سارا ایوان سکوت میں ڈوب گیا۔ لڑکی تھر تھرا اُٹھی۔ رقاصہ بھی تھک کر چور ہوگئی تھی۔

بارہ سفید گھوڑے اُس بگھی کو چلا رہے تھے۔ اطلس اور کمخواب میں ملبوس وہ لڑکی بگھی سے اُتری، جس کے سر پر شیر دل ملکہ کا تاج شاہی رکھنے والا تھا۔ لوگوں کا ایک بہت بڑا ہجوم پُراسرار خاموشی میں ڈوبا ہوا کھڑا تھا، جیسے سب کے لب سی دیئے گئے ہوں۔ اس پُراسرار ماحول میں صرف لڑکی کے سسکنے کی آواز آرہی تھی۔

شہنشاہ نے ملکہ کے سر پر تاج رکھتے ہوئے کہا :

''ہم یعنی وقت کے سب سے بڑے شہنشاہ نے تمہیں منصب شاہی عطا کر کے تمہاری زندگی کو جاوداں کر دیا، ہماری ملکہ!.....دُعا دو اُس لمحے کو، جب ہمارے دل میں تمہارے لئے خواہش پیدا ہوئی اور تمہیں خلوت میں جلوہ افروز ہونے کے لئے پسند کر لیا''

وہ لڑکی اپنے ہی وطن میں ایک قیدی کی زندگی گزارنے کے لئے قربان گاہ میں بھینٹ چڑھائی جارہی تھی۔ خوف سے، ڈر سے اور وہم سے کانپنے لگی۔ شہنشاہ جو اُن کا دیوتا تھا، اُس کے لئے ملک الموت کی صورت اختیار کر گیا۔ وہ اس کی روح کو اپنے قبضے میں لینے کے لئے آگے بڑھ رہا تھا اور وہ شہنشاہ کے پھیلے ہوئے بازوؤں کے حصار سے اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کرتی رہی۔ اس کیفیت میں وہ اپنے آپ کو آزاد کرنے کی جستجو میں لگی ہوئی تھی۔ جب بازوؤں کے حصار میں وہ بند ہو کے رہ گئی تو موت اب یقینی صورت اختیار کر گئی۔ اس لئے اُس نے اپنے موتیوں جیسے سفید دانتوں سے تیز دھار والی تلوار کا کام لیا اور شہنشاہ کا بایاں کان کاٹ لیا۔ شہنشاہ تکلیف سے چیخ پڑا اور اسے ادائے دلبرانہ سمجھ کر نازنین کو دوبارہ اپنے بازوؤں کے حصار میں لینے کے لئے آگے بڑھا۔ لیکن جب کٹے ہوئے کان سے سرخ خون کی لکیر شہنشاہ کے رخسار پر پھیلنے لگی تو بوڑھا پیشوا چیخ پڑا :

''لوگو!.....یہ دیوتا نہیں ہے، تم جیسا ایک معمولی انسان ہے''

شہنشاہ نے جب لوگوں کا ہجوم اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا تو بوکھلا اُٹھا۔ ملکہ کو ایک طرف دھکیل کر اس قہر سے بچنے کے لئے فرار کا راستہ اختیار کرنے لگا تو مفکر نے اُسے روکا اور کہا :

''اب وقت تمہارے ہاتھ میں نہیں ہے، تم وقت کے ہاتھ میں ہو۔ لیکن وقت اب بھی تمہارے ہاتھ میں رہے گا، ایک حقیقی شہنشاہ کی طرح موت کو لبیک کہو''

شہنشاہ آتے ہیں۔ شہنشاہ چلے جاتے ہیں۔ ہر انقلاب تاریخ کو روند کے چلا جاتا ہے۔ وقت کا مفکر بستی بستی، گاؤں گاؤں، شہر شہر اُس فرد کی تلاش میں رہتا ہے جس کے سر پر تاج رکھا جائے۔

☆☆☆

دیپک بدکی



ماسٹر جی

''**ارے** بھائی یہ کیا ہورہا ہے ؟ ہمارے اس چھوٹے سے گاؤں میں اتنی ساری بھیڑ کہاں سے اُمڈ آئی ہے؟'' ایک سادہ لوح کسان نے دوسرے سے پوچھا۔

'' سنا ہے کوئی ماسٹر مر گیا ہے ۔ ماتم میں شریک ہونے کے لیے دور دراز علاقوں سے گیانی پُرش چلے آئے ہیں۔'' دوسرے نے جواب دیا۔

یہ آزادی سے پہلے کا قصہ ہے۔ایک چھوٹے سے گاؤں میں ماتم کرنے والوں کا اتنا سارا ہجوم دیکھ کر وہاں کے سیدھے سادے، ان پڑھ اور ناواقف لوگ حیران ہورہے تھے ۔ گاؤں والوں نے انسانوں کا ایسا اژدہام پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ہاں کبھی کبھار ماسٹر جی کو ڈھونڈنے کچھ پڑھے لکھے لوگ آتے تھے،ان کا ایڈریس پوچھتے تھے اور پھر کچھ وقفے کے بعد ماسٹر جی سے مل کر واپس چلے جاتے تھے۔خود امر چند بھی گاہے بہ گاہے کئی دنوں کے لیے گاؤں سے غائب رہتا تھا اور سنتے تھے کہ شہر میں بڑے بڑے جلسوں جلوسوں میں حصہ لیتا تھا۔اس کے باوجود اس کی سادگی اور طور طریق میں کبھی کوئی فرق نہیں آیا۔وہ اپنے آپ کو گاؤں والوں سے کبھی الگ نہیں کرسکا۔

امر چند کی ارتھی کو کندھا دینے کے لیے اس کے کئی طلبہ آئے تھے جنھیں اس نے ماضی میں نہ صرف پڑھایا تھا بلکہ زندگی گزارنے کا سلیقہ بھی سکھایا تھا۔ان میں سے کئی طالب علم بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہو چکے تھے۔انھوں نے ماسٹر جی کی انتم یاترا کا سارا انتظام اپنے ہاتھوں میں لے لیا کیونکہ ماسٹر جی کا کوئی وارث نہیں تھا۔صرف ایک بیوہ بہن تھی وہ کچھ سال پہلے وفات پا چکی تھی۔ ماسٹر جی بے چارے تو کسمپرسی میں دن گزار رہے تھے یہاں تک کہ ان کو جب آنتوں میں سوزش ہوئی تو انھیں مالی تنگدستی کے سبب مقامی ڈاکٹروں پر قناعت کرنی پڑی۔اب تو ان کے جانے کے بعد گھر مکمل طور پر خالی ہوگیا۔ماسٹر جی نے تو اپنے مستقبل کے بارے میں کبھی سوچا بھی نہیں ۔وہ زمانہ ہی کچھ اور تھا۔اکثر لوگ آدرشوں اور اصولوں کے تابع ہوتے تھے اور گھر بار، رشتے ناطوں کو نظر انداز کر کے وطن پر شہید ہونے کے لیے تیار ہوجاتے۔ ان دنوں آزادی کی لڑائی زوروں پر تھی اور اس کی رہنمائی آدرش وادی ، ستیہ گرہ کے حامی ،روحانیت کے علم بردار اور عدم تشدد کے پجاری مہاتما گاندھی کررہے تھے۔وہ جابر وظالم انگریزوں سے نہتے ہاتھوں لوہا لے رہے تھے اور سارا ہندوستان ان کے اشارے پر مرمٹنے کو تیار ہوجاتا تھا۔

مہاتما گاندھی نے نہ صرف انگریزوں سے آزادی پانے کی تحریک شروع کی تھی بلکہ ہندو سماج کے بُرے رسم ورواج کے خلاف بھی محاذ کھول دیا۔ بال وِواہ کے خلاف اور بیواؤں کی دوسری شادی کے لیے انھوں نے ایک زبردست مہم شروع کر دی جس میں وہ کامیاب رہے ۔ اسی طرح انھوں نے غیر ملکی اشیا کا بہشکار، سرکار کے غلط قانونوں کے خلاف عدم تعاون اور نمک کا آندولن بھی چلایا۔غرض سارے ہندوستان میں جاگرتی لانے میں کامیاب ہوگئے ۔امر چند خود بال وِواہ کا شکار ہوچکے تھے۔بچپن ہی میں والدین نے ان کو ایک ناپسندیدہ لڑکی سے ازدواجی بندھن میں باندھا تھا جو طبیعت سے عیب جو، چڑچڑی اور جھگڑالو تھی۔امر چند نے ابتدا میں کافی صبر کیا، پھر اس سے رہا نہ گیا،اس لیے اپنی بیوی کو چھوڑ کر ایک بیوہ سے دوسری شادی کر لی جو ان کے لیے نعمت ثابت ہوئی اور عمر بھر ان کا ساتھ دیتی رہی۔ان کی حوصلہ افزائی کی وجہ سے ہی ایک ادنیٰ ماسٹر ادب کی دنیا پر چھا گیا۔ سچ کہا ہے کسی نے کہ ہر بڑے انسان کے پیچھے عورت کا ہاتھ ہوتا ہے۔مگر شومئ قسمت وہ بھی چھ سال پہلے سورگ باش ہوگئی اور اپنے پیچھے کوئی اولاد نہیں چھوڑ سکی۔

ماسٹر جی کا داہ سنسکار کر کے طلبہ واپس آرہے تھے اور راستے میں اپنے ماسٹر جی کی یادوں کو ایک دوسرے کے ساتھ بانٹ رہے تھے ۔ امر چند نے اپنے عرصۂ حیات میں ایک دلت طالب علم ہری چند کو شرن دے کر اس کی زندگی سنواری تھی،اس کا سارا بوجھ اٹھایا تھا اور اس کو پڑھا لکھا کر اس قابل بنایا تھا کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہوگیا۔حالانکہ ہری چند کو اچھی سرکاری نوکری مل رہی تھی مگر اس نے کالج میں پڑھانے کو ترجیح دی اور اس طرح ماسٹر جی کے نقش قدم پر چلتا رہا۔آج بھی ہری چند آگے آگے تھا اور اسی نے ماسٹر جی کی چِتا کو اگنی دکھائی تھی ۔ واپسی پر وہ سلیم احمد سے گویا ہوا۔''بھائی سلیم !ماسٹر جی نہ ہوتے تو میں آج اس مقام پر نہ ہوتا۔انھوں نے مجھ یتیم کو اپنایا اور پال پوس کر بڑا کیا۔علم کے نور سے میری زندگی منوّر کی۔میرا سارا وجود ان کا مقروض ہے۔میں نے ان کو کبھی کسی سے نفرت کرتے نہیں دیکھا۔وہ سبھی انسانوں سے محبت کرتے تھے۔''

سلیم احمد نے جواب دیا۔''ہاں ہری چند! تم سچ کہہ رہے ہو۔ انھوں نے مجھے بھی رہنمائی کر کے صحیح راستے پر لگایا۔میرے گھر میں دولت کی ریل پیل تھی۔ میرے والد صاحب محکمۂ مال سے وابستہ تھے۔اپنی تنخواہ

A-102،ایس جی امپریسن،سیکٹر 4-B،وسندھرا،غازی آباد
فون:9868271199
deepak.budki@gmail.com

کے علاوہ کافی بالائی آمدنی تھی۔ مجھے ٹوکنے والا کوئی نہ تھا۔اس لیے میں راہ سے بے راہ ہوگیا تھا۔مگر ایک روز ما سٹر جی نے اسکول میں مجھے اپنے پاس بلایا۔ میرے خلاف ہیڈ ماسٹر کو کئی شکایتیں ملی تھیں۔ اسٹاف میٹنگ میں طے ہوا تھا کہ مجھے وارننگ دی جائے اور اگر میں سدھرا نہیں تو مجھے اسکول سے نکال دیا جائے۔مگر ماسٹر جی نے ہیڈ ماسٹر کو بھروسہ دلایا کہ وہ مجھے راہ راست پر لانے کی کوشش کریں گے۔ ماسٹر جی سے ملتے وقت میں نے بڑی ہیکڑی دکھائی مگر انھوں نے بالکل بُرا نہیں مانا۔ بڑی شفقت سے ملے اور مجھے سمجھانے لگے کہ ''زیست ایک نعمت ہے اور اس کا صحیح استعمال کرنے سے انسان کامیاب ہوتا ہے۔انسان کو چاہیے کہ وہ اس چھوٹی سی عمر میں کچھ نہیں تو کم سے کم دوسرے لوگوں کی مدد کرے، غریبوں اور مفلسوں میں روپے پیسے یا پھر اپنے پرانے کپڑے، کتابیں اور دوسری استعمال کی ہوئی چیزیں بانٹ دے تاکہ وہ بھی گزارہ کرسکیں۔ اسلام میں اسی لیے زکوٰۃ کی تاکید کی گئی ہے۔تم تو ایک اچھے خاندان سے تعلق رکھتے ہو اور تمہارے پاس تو بہت کچھ ہے پھر تم ان چیزوں کو اچھے کام میں کیوں نہیں لگاتے۔''

''کیا تم نے ان کے کہنے پر عمل کیا؟''

''ابتدا میں تو کچھ ہچکچاہٹ ہو رہی تھی مگر آہستہ آہستہ ان کی باتیں میرے دل میں گھر کر گئیں اور میری تقلیب ماہیت ہوگئی۔ مجھے پڑھنے لکھنے سے رغبت ہونے لگی، بی اے، ایل ایل بی کی ڈگریاں حاصل کرلیں اور ساتھ ہی فلاحی کاموں میں شرکت کرنے لگا۔خدا کا شکر ہے کہ میری وکالت چل نکلی اور میں اس وقت کئی فلاحی تنظیموں کے ساتھ وابستہ ہوں۔''

اسی دوران ایک اور سابق طالب علم گفتگو میں شریک ہوا۔''ماسٹر جی کی شخصیت تو بہت پُر اثر تھی۔ شکل وصورت سے تو نحیف، لاغر اور کم گو تھے مگر نہ جانے کیسے مخاطب کو اپنے سحر میں باندھ لیتے تھے۔ سننے والا تو فوراً قائل ہوجاتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ میں دوبار میٹرک کے امتحان میں ناکام ہوا۔ پھر کیا تھا۔ میں نے تعلیم ترک کرنے کی ٹھان لی۔ اتفاق سے میری ملاقات ماسٹر جی سے ہوئی اور انھوں نے مجھے قریب دو گھنٹے اپنے پاس بٹھایا، گرم جوشی کے ساتھ کامیابی اور ناکامی کے درمیان کھنچی باریک سی لکیر پر ولولہ خیز لیکچر دیا اور یہ سمجھایا کہ ہمت کرنے سے کوئی بھی مرحلہ طے کیا جاسکتا ہے۔کچھ اور نکتے بھی سمجھائے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اس سال میں میٹرک میں اچھا ڈویژن لے کر کامیاب ہوا اور اب اچھی خاصی تجارت کر رہا ہوں۔بھگوان ان کی آتما کو شانتی دے۔''

کچھ وقت کے بعد سبھی ماسٹر جی کے گھر پہنچے۔ چھوٹا سا گھر تھا۔اس لیے سب مل بیٹھ کر اس بات پر غور کرنے لگے کہ ماسٹر جی کے گھر اور ہزاروں کتابوں کا کیا کیا جائے۔ آخر کار فیصلہ یہ ہوا کہ اس گھر کو لائبریری میں تبدیل کیا جائے اور ان کتابوں کے لیے الماریاں خرید لی جائیں تاکہ ان کو قرینے سے رکھا جائے۔ پھر کسی ریٹائرڈ شخص کو لائبریری کا کام اور کتابوں کی دیکھ بھال کے لیے مقرر کیا جائے۔سبھی نے اپنی جیب سے رقم دینے کا وعدہ کرلیا اور اس طرح 'امر چند لائبریری' کا قیام عمل میں لایا گیا۔

بہت چھوٹا سا قدم تھا مگر مثبت تھا۔آج وہی لائبریری بہت بڑی لائبریری میں تبدیل ہوگئی ہے۔اب تو یہاں لاکھوں کتابیں ہیں، بیسیوں ملازم ہیں، سرکار نے اسے اپنی تحویل میں لے لیا ہے اور ہر سال گرانٹ ملتی ہے۔ وہ چھوٹا سا گاؤں بھی اب اہم قصبہ بن چکا ہے۔لائبریری کے سامنے امر چند کا ایک بہت بڑا مجسمہ کھڑا ہے جس کو دیکھ کر راہ گزر سجدہ ریز ہوجاتے ہیں۔

☆☆☆

ماہنامہ 'آجکل' کا سالانہ چندہ

ماہنامہ 'آجکل' (اردو) کے سالانہ چندہ کی شرحیں حسب ذیل ہیں:

رجسٹرڈ ڈاک سے رسالہ منگانے کے لیے

سالانہ	434روپے
دوسال کے لیے	838روپے
تین سال کے لیے	1222روپے

سالانہ چندے کی رقم بذریعہ پوسٹل آرڈر/ ڈیمانڈ ڈرافٹ بنام ڈائریکٹر جنرل پبلی کیشنز ڈویژن قابل ادا، نئی دہلی ارسال کریں۔آن لائن ادائیگی کے لیے ملاحظہ کریں ویب سائٹ۔

www.publicationsdivision.nic.in

بزنس منیجر، پبلی کیشنز ڈویژن

7th فلور، سوچنا بھون، سی جی او کمپلیکس، لودھی روڈ، نئی دہلی۔110003

فون نمبر:011-24367453

دہلی میں ماہنامہ آجکل کے فروخت مراکز

بُک گیلری، پبلی کیشنز ڈویژن

سوچنا بھون، سی جی او کمپلیکس، لودھی روڈ، نئی دہلی۔110003

پبلی کیشنز ڈویژن، ہال نمبر196

اولڈ سکریٹریٹ۔دہلی۔110054 فون:011-23890205

ایم ایل اینڈ سنس

شیواجی اسٹیڈیم کمپلیکس، بھگت سنگھ مارگ، نئی دہلی۔110001

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

اردو بازار، جامع مسجد، دہلی۔110006 فون:011-23260668

شمسی بک ڈپو

بٹلہ ہاؤس، جامعہ نگر، نئی دہلی۔110025

ظہیر الدین نیوز پیپر ایجنٹ

نزد غالب اکیڈمی، بستی حضرت نظام الدین، نئی دہلی۔110013

فون:09818593958

اقبال حسن آزاد



رکشہ والا

ابھی رات کا ملگجا باقی تھا کہ شرفو کی آنکھ کھل گئی۔ کچھ دیر تک تو وہ یونہی اپنی چارپائی پر پڑا پلکیں جھپکاتا رہا۔ پھر اُٹھ کر کمرے سے باہر نکلا اور مٹّی کے آنگن کو عبور کرتے ہوئے پیشاب خانے کی طرف چلا گیا۔ رکشے والوں کی اس بستی میں زیادہ تر مکانات مٹّی کے تھے۔ ہر مکان میں ایک آنگن ضرور ہوتا تھا۔ یہ لوگ مرغیاں اور بکریاں بھی پالتے تھے اور تھوڑی بہت سبزیاں بھی اُگا لیتے تھے۔ بکریاں اس وقت سو رہی تھیں لیکن مرغیوں کے کُڑکُڑانے کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ فارغ ہونے کے بعد وہ اپنے کمرے میں واپس آیا۔ اس کی بیوی اور بچے ابھی تک سو رہے تھے۔ وہ دوبارہ پلنگ پر لیٹ رہا۔ تھوڑی دیر بعد پاس والی مسجد سے اذان کی آواز ابھری تو اس نے چارپائی چھوڑ دی۔ وہ نماز کا پابند نہیں تھا مگر جب کبھی اسے خدا یاد آتا تو وہ خدا کے دربار میں حاضر ہو جاتا۔ آج بھی وہ وضو کر کے مسجد کے لیے نکل کھڑا ہوا۔

نماز پڑھ کر واپس آیا تو اس کی بیوی بیدار ہو چکی تھی۔ اس نے رات کی بچی ہوئی روٹی اور گڑ کا ایک ڈھیلا تام چینی کی رکابی میں رکھ کر اس کے آگے کر دیا۔ اس نے پانی اور گڑ کے ساتھ روٹی کھائی اور رکشہ لے کر کھلی سڑک پر نکل آیا۔

یہ ایک چھوٹا سا نیم خوابیدہ شہر تھا۔ یہاں رات کے ہنگامے نہیں ہوتے تھے لیکن صبح صادق سے ہی سڑکوں پر چہل پہل شروع ہو جاتی تھی۔ بڑی سڑک پر پہنچ کر اس نے اپنا رکشہ ایک کنارے لگایا اور سامنے والے چائے خانے میں جا کر چائے پی۔ اور پھر کسی سواری کا انتظار کرنے لگا۔

سڑک کے دونوں طرف دوکانیں تھیں۔ پاس کے محلے میں رہنے والے وہاں اپنا روزگار چلاتے تھے۔ جب ٹیلیفون عام ہوا اور جگہ جگہ پی سی او کھلنے لگے تو سرفراز نام کے ایک نوجوان نے بھی ایک دکان لے لی۔ دوسری جانب کی دکانوں کے آخری سرے پر ایک شخص کے مکان کی باہری دیوار تھی۔ اسی دیوار کے سہارے فضلو میاں کی چائے کی دکان تھی۔

شاہ کالونی، شاہ زبیر روڈ، مونگیر۔811201
فون:8210498674
eqbalhasan35@yahoo.com

دکان کیا تھی بس لکڑیوں کو جوڑ کر پٹرا سا بنا لیا گیا تھا۔ مکان مالک سنتوشی کب کا مر چکا تھا۔ فضلو میاں نے اسی سے بات کی تھی اور کچھ کرایہ بھی طے ہوا تھا۔ سنتوشی کے مرنے کے بعد اس کے بیٹے نے وہ جگہ خالی کروانی چاہی مگر وہ دکان تو ان کی روزی روٹی کا واحد ذریعہ تھی، خالی کیسے کر دیتے۔ پچاس برس کے فضلو میاں رنڈوے تھے۔ چھوٹا قد، سیاہ رنگ اور دبلی تپلی کایا۔ اکثر دکان کے کنارے اپنی کھٹیا بچھا کر سو رہتے تھے۔

وہ ساٹھ کے پیٹے میں ایک ایسا شخص تھا جس کی زندگی کا بیشتر حصہ رکشہ کھینچتے گزرا تھا۔ پہلے اس کا باپ یہ کام کرتا تھا لیکن جب اس کی عمر بیس سال کی تھی تو اس کے باپ کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت اس کی بہن پندرہ سال کی تھی اور چھوٹا بھائی راجو دس برس کا۔

اس زمانے میں وہ ایک دبلا پتلا چھریرے جسم کا سانولا سا نوجوان ہوا کرتا تھا۔ اسے تاش کے پتّوں سے دل بہلانے، سنیما دیکھنے اور مٹر گشتی کرنے کا بہت شوق تھا۔ مگر جب اس نے ماں کی آنکھوں کی ویرانی دیکھی تو آنگن میں کھڑے رکشے کو نکال کر سڑک پر آ گیا۔ اس سے پہلے اس نے کبھی رکشہ نہیں چلایا تھا۔ ہاں، کبھی کبھی شوقیہ دو چار پیڈل مار لیا کرتا تھا۔ پہلے دن اس نے اتنے پیسے کما لیے تھے کہ گھر کا چولہا جل سکے۔

رکشے کی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے جب وہ تھک گیا تو نیچے اتر کر سڑک پر ٹہلنے لگا۔ اسی سڑک پر آگے جا کر ایک سنیما ہال تھا۔ اسے یاد آیا کہ اب سے چالیس سال قبل سنیما ہال آباد تھے اور پہلا دن، پہلا شو کا کریز نوجوانوں میں عام تھا۔ شہر میں پہلے تین سنیما ہال تھے۔ بعد میں دو اور کھل گئے۔ کسی نہ کسی میں کوئی کامیاب فلم لگی ہوتی۔ وہاں تماش بینوں کی بھیڑ ہوتی۔ رکشے والے شوٹو ٹنے سے پہلے وہاں اپنے رکشے لگا دیتے۔ اگر رش زیادہ ہوتا اور مسافر دور کا ہوتا تو منہ مانگا کرایہ بھی مل جاتا۔

دس بج چکے تھے مگر ابھی تک کسی سواری کا پتا نہ تھا۔ وہ سڑک کے کنارے اکڑوں بیٹھ گیا اور پرانی یادوں میں کھو گیا۔

یادیں خواہ صاحبِ زر کی ہوں یا کسی غریب کی، وہ اس کی زندگی کا قیمتی سرمایہ ہوتی ہیں۔ انسان کی عمر جب ڈھلان پر ہوتی ہے اور اس کے آس پاس کی دنیا بدلنے لگتی ہے، نئی چیزیں اس کی آنکھوں میں اجنبیت پیدا کرنے لگتی ہیں تو یہی پرانی یادیں اس کے جینے کا سہارا بنتی ہیں۔ وقت کو گزرنا ہوتا ہے، گزر جاتا ہے اور گزرتا ہوا وقت یادوں کی فصل اگاتا ہے۔

اس کا بھائی اور بہن جوان ہوتے گئے اور ماں بوڑھی ہوتی چلی گئی۔ پھر اس کی بہن کی شادی ہو گئی اور وہ اپنے سسرال چلی گئی۔ چھوٹا بھائی راجو بھی رکشہ چلانے لگا۔ اب اس کی ماں نے اس پر شادی کر لینے کا زور ڈالنا شروع کیا۔ پہلے پہل تو وہ ٹالتا رہا لیکن جب راتوں کی تنہائی میں خون کی روانی سے اس کا جسم سخت اور اس کی بے چین کروٹوں سے پلنگ کی بان ڈھیلی ہونے لگی تو اس نے ماں کی بات مان لی اور اس طرح گھر میں ایک اور فرد کا اضافہ ہو گیا۔

جس طرح دھوپ، ہوا اور پانی پیڑ پودوں پر اثر انداز ہوتے ہیں اسی طرح یہ چیزیں انسانوں پر بھی اثر انداز ہوتی ہیں۔ شرفو کی ماں کی ہڈیاں دن بدن کمزور ہوتی گئیں اور چھوٹے بھائی راجو کا بدن روز بروز مضبوط ہوتا گیا۔ اب وہ بھی شادی کے خواب دیکھنے لگا تھا۔ شرفو کے بعد دیگرے دو بچوں کا باپ بن گیا اور گھر میں جانوروں کی آوازوں کے ساتھ ساتھ بچوں کا شور بھی شامل ہو گیا۔

پھر ایک روز راجو کے سر پر بھی سہرا بندھ گیا۔ لیکن ابھی سہرے کی کلیاں پوری طرح مرجھائی بھی نہیں تھیں کہ ماں کا انتقال ہو گیا۔ اور جیسا کہ زمانے کا دستور ہے والدین کا سایہ سر سے اُٹھ جانے کے بعد دلوں کا بٹوارہ ہو جاتا ہے سو شرفو اور راجو نے بھی اس چھوٹے سے گھر کا بٹوارہ کر لیا۔

وہ انہی خیالوں میں گم تھا کہ کوئی اس کے رکشے کے قریب آ کر رکا۔ وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا اور اپنے گچھے سے رکشے کی سیٹ صاف کرنے لگا۔ پھر اس نے سواری کو رکشے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ لیکن بیٹھنے سے پہلے اس نے پوچھا۔

''چوک بازار جانے کا کیا لو گے؟''

''چالیس روپے۔''

''نہیں یہ بہت زیادہ ہے۔ ای رکشہ والے تو دس روپے میں پہنچا دیتے ہیں۔''

اس کے جی میں آیا کہ کہہ دے کہ تو پھر اسی سے چلے جایئے

لیکن پھر جب اسے خالی جیب کا خیال آیا تو بڑی لجاجت سے بولا۔

''اچھا، تیس روپے دے دیجئے گا۔'' اس شخص نے ہلکے سے سر کو جنبش دی اور رکشے پر بیٹھ گیا۔ اسے یاد آیا کہ جس وقت اس نے رکشہ چلانا شروع کیا تھا، چوک ہو یا اسٹیشن، سنیما ہال ہو یا پارک..... ہر جگہ کا کرایہ ایک روپیہ تھا۔ اس وقت رکشے والوں کی بڑی شان تھی۔ سواری منتیں کر رہی ہے مگر آپ ہیں کہ اکڑے بیٹھے ہیں۔ ''ابھی ہمیں کہیں نہیں جانا، دھوپ بہت ہے۔ آپ کوئی اور رکشہ کر لیں۔'' اور اگر رکشہ پورب کی طرف جا رہا ہے تو کیا مجال کہ پچھّم جانے والوں کو بٹھا لے۔ لیکن ای رکشہ جسے عرف عام میں ٹوٹو کہا جاتا تھا، نے آ کر رکشہ والوں کا سارا غرور مٹّی میں ملا دیا تھا۔ اس میں نہ پٹرول بھروانے کا جھنجھٹ تھا نہ ڈرائیونگ لائسنس کی حاجت۔ پچاس روپے میں ریچارج کرواؤ اور فی سواری دس روپے بٹھاؤ۔ ایک روپے سے شروع ہو کر رکشے کا کرایہ ایک سے دو، دو سے چار، آٹھ، دس، بیس اور پچاس روپے تک جا پہنچا تھا۔ اب سواریاں دس کی جگہ پچاس کیوں خرچ کریں۔ اب تو یہ حالت تھی کہ کوئی سائیکل رکشہ کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھتا تھا۔

مگر اب وہ دن بس یاد بن کر رہ گئے تھے۔

اسے یاد آیا کہ یہاں کے انگلش میڈیم اسکولوں کی اپنی کوئی بس سروس نہیں تھی چنانچہ وہاں پڑھنے والے بچے ان ہی رکشوں پر سوار ہو کر اسکول جایا کرتے تھے۔ ایک رکشے پر چھ سات بچے ہوتے تھے۔ تین چار بچے سیٹ پر اور باقی لکڑی کے بنچ پر جو رکشے کے پائیدان پر رکھ دی جاتی تھی۔ بچوں کو اسکول پہنچانے کے بعد بنچ اتار کر رکھ دی جاتی اور عام سواریاں ڈھوئی جاتیں۔ بچوں سے ماہانہ کرایہ طے کر لیا جاتا تھا۔ انگلش میڈیم کے اسکول میں رکشہ والوں کے بچوں کو پڑھانے کے لیے الگ سے انتظام تھا۔ ان سے کوئی فیس نہیں لی جاتی تھی۔ زیادہ تر رکشہ والوں نے اپنے بچوں کا داخلہ وہاں کروا رکھا تھا۔ شرفو بھی ان ہی لوگوں میں سے تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے بچے بڑے ہو کر اس کے باپ دادا کی طرح رکشہ چلائیں۔

سواری کو بازار میں اتار کر وہ کسی دوسری سواری کا انتظار کرنے لگا۔ ابھی مشکل سے پانچ منٹ گزرے تھے کہ ایک سپاہی نے اس کے رکشے پر اپنا ڈنڈا بجایا اور نہایت کھردرے لہجے میں اسے وہاں سے ہٹ جانے کو کہا۔ اس نے خشمگیں نظروں سے سپاہی کی جانب دیکھا اور رکشے کو آگے بڑھا دیا۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر بھٹکنے کے بعد وہ پھر اپنے علاقے کی طرف پلٹ پڑا۔

دوپہر ڈھل چکی تھی۔ اسے زوروں کی بھوک لگ رہی تھی۔ اس نے رکشہ گھر کی جانب موڑ لیا۔ گھر پہنچ کر اس نے کمائی کے تیس روپے بیوی کے حوالے کیے اور ہاتھ منہ دھو کر پلنگ پر بیٹھ گیا۔ بیوی نے ایک رکابی میں چاول، دال، سبزی اور آم کا اچار رکھ دیا۔ اس نے بیوی کو پیار بھری نظروں سے دیکھا اور مزے لے لے کر کھانا کھانے لگا۔ کھانا کھا چکنے کے بعد اس پر غنودگی سی چھانے لگی اور وہ اسی پلنگ پر لیٹ رہا۔ تھوڑی دیر ہی میں وہ گہری نیند سو رہا تھا۔

عصر کی اذان سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور باہر نکل گیا۔ اب اس کے پاس سوائے آدمیوں کو ڈھونے کے کوئی اور کام نہ تھا۔ پہلے رکشے والوں کا ایک کام گیس سلنڈر لانا بھی تھا۔ وہ ایک ساتھ کئی خالی سلنڈر لے کر جاتے اور بھرے سلنڈر لے کر آتے اور فی سلنڈر پچاس روپے کماتے۔ مگر اب وقت بدل چکا تھا اور جب وقت بدلتا ہے تو بہت کچھ بدل جاتا ہے۔

کیا سے کیا ہو گیا دیکھتے دیکھتے۔

گرمیوں کے موسم میں ایک روز فضلو میاں مچھر دانی تان کر سوئے تھے کہ ان کی کھٹیا میں آگ لگ گئی۔ رات کا پچھلا پہر تھا۔ سب لوگ گہری نیند سوئے ہوئے تھے۔ جب تک ہلّہ ہوتا اور جاگ پڑتی فضلو میاں جل کر خاک ہو چکے تھے۔ پولس نے تفتیش شروع کی۔ شک کی بناء پر سنتوشی کے بیٹے کو گرفتار کیا گیا مگر وہ جلد ہی چھوٹ کر باہر آ گیا اور جہاں پر فضلو میاں کی دکان تھی وہاں پر اب دُکھن کی دکان تھی۔ جور کشے والے پہلے شرفو کی چائے پیتے تھے اب دُکھن کی پینے لگے تھے۔

کیا سے کیا ہو گیا دیکھتے دیکھتے۔

صرف انسان ہی نہیں مرتے، تہذیبیں اور زبانیں بھی مرتی ہیں اور پیشے اور روزگار بھی۔ پہلے سرفراز کے پی۔ سو۔ او۔ میں فون کرنے والوں کی بھیڑ لگی رہتی تھی۔ ہر چھوٹا بڑا کسی نہ کسی کام سے فون کرنے کے لیے آتا لیکن پھر دھیرے دھیرے فون کی جگہ موبائل نے لے لی اور فون وہاں سے ہٹ گیا۔ اب آس پاس کے لوگ وہاں اپنا موبائل ریچارج کرنے کے لیے آنے لگے۔ لیکن وہ جو کہتے ہیں نا کہ ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں' تو جب لوگوں کو گھر بیٹھے ریچارج کرنے کی سہولت حاصل ہو گئی تو یہ سلسلہ بھی رفتہ رفتہ ختم ہو گیا۔ سرفراز نے اب فوٹو اسٹیٹ مشین لے لی تھی اور اب یہی اس کا روزگار رہا۔ مگر شرفو اپنا روزگار کیسے بدلے؟ کئی رکشے والوں نے دوسرے کام دھندے اپنا لیے تھے۔ چند ایک سبزیاں اور پھل بیچنے لگے تھے۔ کچھ محنت مزدوری کرنے لگے تھے اور دو رکشہ والے تو اچھے خاصے باورچی بن گئے تھے اور شادیوں اور تقریبوں میں پلاؤ، بریانی، قلیہ اور قورمہ بنانے لگ گئے تھے۔ مگر شرفو کو اپنے رکشے سے پیار تھا۔ پہلے وہ اپنے رکشے کو دولہے کی طرح سجا سنوار کر رکھتا تھا۔ خوشنما جھالر اور گھنٹیاں اس کے رکشے کی خاص پہچان تھیں۔ جب وہ دھیرے دھیرے رکشہ چلاتا تو ایسا لگتا جیسے فضاؤں میں کوئی مدھر نغمہ گونج رہا ہو اور جب کبھی اس کے رکشے پر جوان زنانیاں سوار ہوتیں تو وہ ہوا سے باتیں کرنے لگتا۔ ایسے میں گھنٹیوں کی تیز آوازیں اور دبی دبی نسوانی چیخیں اسے ایک خاص لطف و سرور عطا کرتیں۔ مگر اب اس کا رکشہ ایک ایسے خزاں رسیدہ درخت کی طرح ہو چکا تھا جس کے سارے پتّے جھڑ چکے تھے اور زنانیاں اب لیڈیز بن کر آٹو اور ٹوٹو کو رونق بخش رہی تھیں۔ مگر پھر بھی اسے اپنا رکشہ پیارا تھا۔ وہ اسے کیسے چھوڑ دیتا۔ کیا ماں باپ کے بوڑھے ہو جانے پر انہیں چھوڑ دینا چاہیے؟

گزرتے وقت کے ساتھ اس کی آمدنی بہت محدود ہو گئی تھی کیونکہ اب ہر گھر میں ٹی وی آ گیا تھا اور سارے سنیما ہال بند ہو چکے تھے۔ شہر میں دیکھتے ہی دیکھتے اسکول کے لیے پرائیویٹ وین چلنی شروع ہو گئی تھی۔ یہ سستی اور محفوظ سواری تھی۔ اب بچے رکشوں کی جگہ وین سے اسکول جانے لگے تھے۔ دھیرے دھیرے گیس ایجنسیوں نے ہوم ڈلیوری شروع کر دی اور آمدنی کا یہ راستہ بھی مسدود ہو گیا۔

اس کے چھوٹے بھائی راجو نے اپنا رکشہ بیچ دیا اور بینک سے قرض لے کر ای رکشہ خرید لیا۔ اس کی بیوی نے اسے بھی ایسا ہی کرنے کا مشورہ دیا مگر اسے یہ نئی سواری ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ رکشہ چلاتے وقت وہ خود کو بلندی پر محسوس کرتا اور جب جب بھیڑ میں سے گزرتے وقت تیز تیز گھنٹیاں بجاتا تو اسے خوب مزہ آتا۔ مگر اس سواری پر تو ڈرائیور کی کوئی حیثیت ہی نہیں تھی۔ چھوٹے چھوٹے پہیوں کے ساتھ زمین سے لگا ہوا لوہے کا ڈبہ۔ اسے دن بھر میں چار پانچ سواریاں بھی مل جاتیں تو وہ خوش ہو جاتا۔ اب نہ تاڑی پینے کی لت باقی تھی اور نہ ہی سنیما دیکھنے کا شوق۔ ایک روز اس کے دوست جمّن نے اپنا ای رکشہ سیکھنے کی غرض سے اس کے حوالے کیا۔ پہلے تو اس نے انکار کیا لیکن جمّن کے بہت زور دینے پر وہ راضی ہو گیا۔ مگر ہائے رے قسمت! ابھی وہ کچھ ہی دور چلا تھا کہ ایکسیڈنٹ کر بیٹھا۔ رکشے کو جو نقصان ہوا سو ہوا، اسے اور جمّن کو بھی چوٹیں آئیں۔ اس کے بعد سے اس نے ای رکشہ کو ہاتھ لگانے سے توبہ کر لی۔

شرفو کو رکشے پر بیٹھے بیٹھے اونگھ آ گئی تھی۔ اچانک کوئی ای رکشہ ایک جھٹکے سے اس کے رکشے کے قریب رکا تو اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس کا چھوٹا بھائی سواریوں سے پیسے وصول کر رہا تھا۔ اس کے چہرے پر محنت کا پسینہ چمک رہا تھا اور پیسوں کو دیکھ کر اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ اس نے شرفو پر ایک اچٹتی سی نظر بھی نہ ڈالی اور اپنا ٹوٹو اسٹارٹ کر کے آگے بڑھ گیا۔

شہر میں رات اتر آئی تھی۔ بجلی گل تھی۔ سڑک پر ٹریفک کم ہو گیا تھا۔ اب کسی سواری کے ملنے کی اُمید نہیں تھی۔ وہ کسلمندی کے ساتھ رکشے سے اُتر پڑا۔ دونوں ہاتھ اوپر کر کے اس نے دو تین جمائیاں لیں اور رکشہ اپنے گھر کی سمت موڑ دیا۔ آس پاس کی دکانوں سے بیٹری سے جلنے والے بلب اپنی ناکافی روشنی سے رات کی قسمت کا اندھیرا چیرنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ شرفو کی کمزور ٹانگیں پیڈل کو گھما رہی تھیں اور رکشے سے ریں ریں کی آواز بلند ہو کر فضاء میں گونج رہی تھی۔

☆☆

ڈاکٹر ریاض توحیدی کشمیری



پھول اور خوشبو

آسمان کی بارش سے سمندر کا پیٹ پُر ہو رہا تھا۔ دھوپ نکلتے ہی جب سورج کی کرنیں سمندر کے سینے کو چیرنے لگیں تو بارش کا یہی پانی بھاپ بن کر پھر سے آسمان کی جانب اٹھنے لگا۔ چالیس سال سے وہ اپنے گھر کے کتب خانے کی سمندر والی کھڑکی سے یہ نظارہ دیکھتے آیا تھا۔ بچپن میں جب وہ بارش اور سمندر کا یہ نظارہ دیکھتا تو لطف اندوز ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے اندر سے ایک عجیب قسم کا اضطراب پیدا ہو جاتا اور یہ اضطراب اس وقت اور زیادہ بڑھ جاتا جب وہ بارش تھم جانے کے بعد آسمان کی طرف دیکھتا رہتا۔ کبھی کبھی وہ سوچتا:

''بارش سے سمندر.... سمندر سے بارش اور پھر بارش سے سمندر... کتنا حسین رشتہ ہے۔ ان دونوں کا وجود ایک دوسرے کے بغیر ادھورا ہے۔''

بچپن میں اس کی سوچ بس اسی خیال تک محدود تھی۔ لیکن عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ روح کی بے قراری میں اضافہ ہوتا گیا۔ صبح کے وقت وہ مکتب چلا جاتا اور اس کے بعد سرکاری اسکول۔ ایک دن جب استاد نے بورڈ پر درخت اور سیب کی تصویر بنائی اور نیوٹن کے فارمولے 'کشش ثقل' کو سمجھانے لگا کہ پیڑ سے سیب اسی کشش کی وجہ سے زمین پر گرتا ہے یعنی یہ زمین اور سیب کا رشتہ ہوا تو اس کے اندر سے سمندر بارش کا تعلق موجیں مارنے لگا اور روح میں ایک ہلچل سی مچ اٹھی۔ یہی کیفیت اس پر اذان کے الفاظ 'حی علی الفلاح' سن کر طاری ہو جاتی اور مسجد میں جا کر نماز پڑھنے کے ساتھ ہی اس کی روح تسکین کی مٹھاس سے سرشار ہو جاتی۔ پھر وہ مسجد کے مکتب میں کچھ دیر تک امام صاحب کے پاس بیٹھ جاتا اور دوسرے لوگوں کے ساتھ آنکھیں بند کر کے پند و نصیحت سے اطمینان کی سانس لیتا۔

جب اس کی سوجھ بوجھ تھوڑی بہت بڑھ گئی تو بارش اور سمندر کے کھیل کا چکر اس پر زیادہ اثر انداز ہونے لگا۔ وہ کئی کئی گھنٹوں تک روح کی پیاس کے بارے میں کھو کر سوچتا رہتا۔ موسم سرما میں ایک دن وہ کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا کہ اس کی نظر صحن کے پیڑ پر بیٹھے ایک گم صم پرندے پر پڑی۔ پرندہ بہت خوبصورت تھا۔ جو کہ سرما میں کسی اور خطہ سے ہجرت کر کے وہاں چلا آیا تھا اس موسم میں اکثر دوسرے خطوں کے پرندے وہاں آتے رہتے تھے۔ لیکن اس کی مایوس صورت سے لگ رہا تھا کہ غالباً اپنے ساتھی کے بچھڑنے کے فراق میں اس کا دل ڈوبتا جا رہا ہے۔ دھیرے دھیرے اسے بھی ایسا محسوس ہونے لگا کہ اس کی روح کسی مہاجر پرندے کی طرح اپنے ساتھی کی تلاش میں ازل سے بے چین بھٹک رہی ہے۔

وہ اب جوانی کی سرحد کو پار کر چکا تھا۔ لیکن اب بھی صبح کی نماز ادا کرنے کے بعد مکتب میں بزرگ مولوی صاحب کے درس میں بیٹھ جاتا۔ مولوی صاحب کبھی کبھار اس سے فرماتے تھے:

'' آپ کی موجودگی سے دل میں ایک سکون سا آجاتا ہے نہیں تو بیشتر لوگ بس بچپن کے ایام میں ہی مکتب کا رخ کرتے ہیں اور دین کی چند باتیں سیکھ کر دنیا کے رنگ میں کھو جاتے ہیں۔''

مولوی صاحب کی باتیں سن کر اس کے دل میں بھی اطمینان کی لہر سی اٹھتی۔ کئی بار اس نے سوچا کہ وہ مولوی صاحب سے دل کی بات بتائے کہ اس کی روح ہمیشہ بھٹکتی رہتی ہے لیکن کبھی دوسرے لوگوں کی موجودگی اور کبھی کہنے کا خوف اس کے آڑے آتا۔ جب دل کے سمندر میں سونامی کی لہروں نے زیادہ ادھم مچائی تو دماغ کی نسیں پھٹنا محسوس ہوئیں اور احساس نے لفظوں کی صورت اختیار کی:

'حضرت'! بچپن سے میرا دل بے قرار ہے۔ میری روح ہمیشہ تڑپتی رہتی ہے جیسے کوئی پرندہ اپنے ساتھی سے بچھڑ گیا ہو اور اپنے بچھڑے ساتھی کے وصال کے لئے تڑپ رہا ہو۔''

بزرگ مولوی صاحب یہ سن کر اس کے چہرے کو تکنے لگے۔ تھوڑی دیر تک خاموش رہنے کے بعد انہوں نے معروف صوفی بزرگ سید علی ہجویریؒ کے قول کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا:

''نفس کو اس کی خواہش سے دور رکھنا حقیقت کے دروازے کی چابی ہے۔''

یہ قول سنتے ہی اس پر لرزہ طاری ہو گیا اور خوفزدہ ہو کر پوچھا:

''یہ حقیقت کا دروازہ کیا ہے؟''

''محبوب کے وصال کا دروازہ۔''

''اس کا راستہ.....؟''

''مرشد کی تربیت۔''

''مرشد کی پہچان۔''

یہ سنتے ہی مولوی صاحب نے تھوڑی دیر کے لئے آنکھیں بند کیں اور پھر فرمایا:

''دراصل یہ دل کا جہان ہوتا ہے۔ جب بھی دل کسی پاک روح کی رفاقت قبول کرتا ہے تو پہچان کا سرا ہاتھ آتا ہے۔''

پہچان کا سفر شروع ہوا۔ دل کا جہان مرشد کی تلاش میں بھٹکتا رہا۔ کہیں سراب ہی سراب نظر آتا اور کہیں پر پھول کی صورت میں کانٹے ہی کانٹے دکھائی دیتے۔ روح میں جب اضطراب کی کیفیت حد سے زیادہ بڑھنے لگی اور ذہن پر ایک عجیب سا غبار چھا گیا تو عشق کا سمندر محبوب کے وصال کے لئے موجیں مارنے لگا۔ اب نماز کے وقت

وادی پورہ، ہندواڑہ، کشمیر۔193221
فون: 7006544358
drreyaztawheedi777@yahoo.com

بھی دل میں ابلتی ہانڈی کی طرح جوش آتا رہتا۔ سفر پہچان جب طویل ہوا تو ایک رات خواب میں ایک نورانی چہرے کا دیدار نصیب ہوا۔صبح کی نماز پڑھنے کے بعد خواب کا ذکر مولوی صاحب کے سامنے کیا گیا۔ یہ سنتے ہی مولوی صاحب کی آنکھوں میں نور سا پھیل گیا اور وہ کافی دیر تک اس کے چہرے کو تکنے کے بعد بولے:

''انجم عثمانی صاحب.....کیا آپ کو اپنے نام انجم کا معنیٰ پتہ ہے۔''

''جی مولوی صاحب.....ستارہ۔''

''بے شک تم ایسے روشن ستارے ہو جو اپنی منزل کو پہنچنے والا ہے۔مبارک ہو۔جاؤ،اس پاک روح کا مسکن مشرقی گلستان کے نزدیک ہے۔''

سفر طویل تھا لیکن روح کی پیاس کے سامنے کچھ بھی نہیں تھا۔اہل خانہ سے رخصت لے کر وہ سفر کے لئے نکل پڑا۔ ایک رات وہ ایک ایسی بستی میں پہنچا جہاں پر اس کا کوئی جان پہچان والا نہیں تھا۔عشاء کی نماز ادا کرنے کے بعد جب لوگ ایک ایک کر کے نکلنے لگے تو وہ مسجد کے قریب ہی ایک باغ میں ہی ٹھہرا اور چادر بچھا کر لیٹ گیا۔ چند لمحوں کے بعد ایک اور آدمی سلام کرنے کے بعد اس کے نزدیک آ کر بیٹھ گیا۔ چاند کی روشنی ہر طرف چمک رہی تھی۔اس آدمی نے تھیلی سے کھانے کا سامان نکالا اور اسے آواز دے کر کھانے کے لئے کہا۔ وہ یہ سن کر کھڑا ہوا اور دونوں کھانا کھانے میں لگ گئے۔ کھانا کھانے کے دوران تعارف ہوا اور باتوں باتوں میں پتہ چلا کہ دونوں ایک ہی منزل کے راہی ہیں۔اسی دوران وہاں پر ایک کتا نمودار ہوا۔ اس آدمی نے تھیلی کا منہ کھول کر ایک روٹی نکالی اور ٹکڑے کر کے کتے کی طرف پھینکی۔ یہ دیکھ کر اس نے آدمی سے پوچھا:

''یہ کتا اچانک کہاں سے آ گیا۔''

''یہ میرے ساتھ ہے۔''اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔''ویسے کتا تو انسان کے ساتھ ہی ہوتا ہے۔''

''انسان کے ساتھ ہی ہوتا ہے۔''وہ حیراں ہو کر بولا۔''میں کچھ سمجھا نہیں!!!''

''بزرگ فرماتے ہیں کہ انسان کا نفس بھی کتے کی طرح ہوتا ہے۔''اس نے کتے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔''اگر قابو میں رہا تو دوست بن جائے گا،اگر قابو سے باہر ہو گیا تو دشمن۔ پھر انسان کو تباہ کئے بغیر نہیں چھوڑتا۔''

یہ سن کر اس کو ایک جھٹکا سا لگا جیسے اچانک کسی بچھو نے کاٹا ہو۔وہ کبھی اس آدمی کی طرف،کبھی کتے کی طرف اور کبھی خود کو دیکھتا رہا۔آدھی رات تک وہ نفس اور کتے کا موازنہ کرتا رہا۔ پھر نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

صبح کی نماز ادا کرنے کے بعد دونوں سفر پر روانہ ہوئے۔آج کا دن ان دونوں کے لئے خوشی کا دن تھا کیونکہ کئی روز کی مسافت کے بعد وہ پاک روح بزرگ تک پہنچنے والے تھے۔شام کے سائے پھیل رہے تھے۔ دونوں پاک روح کے مسکن پر پہنچ گئے۔ اپنا تعارف اور مقصد بتانے کے بعد انہیں مسافر خانے میں ٹھہرایا گیا۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد اس آدمی نے چند روٹیاں ہاتھ میں لے کر باہر کتے کو کھلائیں۔نصف شب سے پہلے انہیں بزرگ کے دربار میں حاضر کیا گیا۔ بزرگ کا نورانی چہرہ دیکھ کر دونوں کے دل خوشی سے شاد ہوئے۔ ذکر واذکار کا دور شروع ہوا۔ ہر طرف نورانی ماحول پھیلا ہوا تھا۔ کمرہ لوگوں سے بھرا پڑا تھا۔نصف شب کے بعد بزرگ کے منہ سے اصلاح نفس کے موتی نکلنے لگے:

''اپنے نفس کو قابو میں رکھو۔شیطان کا وار نفس پر ہی ہوتا ہے۔ وہ نفس کو دھوکہ دے کر پھول سے کانٹا بنا دیتا ہے۔اس کے لئے وہ انسان کی عقل کو اپنے قابو میں کرنے کی کوشش کرتا ہے اور باطل پر حق کا رنگ چڑھا کر انسان کو گمراہ کر دیتا ہے۔اس لئے جب ایسا محسوس ہو جائے کہ عقل بھٹک رہی ہے تو دل کے جہان میں عافیت تلاش کرو۔ کیونکہ دل گلاب کی طرح ہوتا ہے اور دماغ کانٹوں کی طرح الجھتا رہتا ہے۔''

بزرگ کی تربیت سے لوگوں کے دل سرشار ہوئے اور وہ ایک ایک کر کے وہاں سے نکل پڑے۔اس کے دل میں نور کی نئی کرنیں اترنے لگیں۔وہ رات دیر تک بزرگ کی باتوں کے سحر میں کھویا رہا۔کئی مہینوں تک تربیت کا یہ سلسلہ چلتا رہا۔ایک شب انہیں بزرگ سے ملاقات کے لئے لے جایا گیا۔دونوں احترام کے ساتھ بزرگ کے سامنے بیٹھ گئے۔ بزرگ ذکر واذکار سے فارغ ہو کر شگفتہ لہجہ میں بولے:

''اللہ کے بندو! کس مقصد سے آئے ہو؟''

بزرگ کی شیریں آواز سے دونوں کے دلوں میں ٹھنڈک پڑ گئی۔انجم عثمانی نے اپنا تعارف کراتے ہوئے بتایا:

''حضرت! بچپن سے میرا دل کسی نامعلوم محبت کے لئے تڑپتا رہتا ہے۔ میرے پاس سب کچھ ہونے کے باوجود میری روح کسی بچھڑے پرندے کی طرح اپنے رفیق کے فراق میں سرگرداں رہتی ہے۔ کبھی کبھی مجھے ایسے لگتا ہے کہ جیسے میں کسی بڑے سمندر کا بچھڑا ہوا قطرہ ہوں جو سمندر کے وصال کی تڑپ میں مرے جا رہا ہو۔''

بزرگ نے یہ سن کر اطمینان کی سانس لی اور اس کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے بولے:

''یہ حقیقت کی تلاش کی کیفیت ہے جو بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔''

''حقیقت کی کیفیت.....؟''وہ ملائم لہجے میں بولا۔''حضرت...یہ کونسی کیفیت ہوتی ہے؟''

''یہ روح کی وہ کیفیت ہوتی ہے جس کی طرف مولانا رومیؒ نے اشارہ کیا ہے کہ کنویں سے پانی کا ڈول نکالتے وقت وہ بھاری اس لئے ہو جاتا ہے کیونکہ وصل کے فراق میں کنویں کے پانی کی کشش اسے اپنی طرف کھینچتی رہتی ہے۔''

''حضرت!اس کے مطلب' سے ہمیں آگاہ کریں۔'

''یہ عشق حقیقی کی کیفیت ہوتی ہے جو خدا اور بندے کے عشق کے درمیان ایک راز ہوتا ہے۔''

''اس کا علاج کیا ہے تا کہ میری پیاسی روح کی پیاس بجھ جائے۔''

''بس اس کیفیت کو ایسے ہی رہنے دیں کیونکہ یہ مبارک روح کا جوہر ہے اور اپنے محبوب کا عشق ہمیشہ اپنی روح میں بسائیں۔جس طرح پھول اور خوشبو کا عشق ہوتا ہے۔''

''لیکن وصال کی کیا صورت ہے؟''

''بس خالق کے فرمان کو احساس کا حصہ بناؤ جو تمہیں آخرت میں محبوب کے دیدار سے سرخرو کرے گا۔''

''وہ فرمان کیا ہے؟''

(ہم شہ رگ سے بھی زیادہ اس (انسان) کے قریب ہیں۔)

یہ نورانی پیغام سنانے کے بعد وہ رخصت کر دیے گئے۔

برسوں بعد اس کی روح کو تسکین مل گئی۔ دوسرا آدمی وہیں پر ٹھہر گیا کیونکہ وہ مزید تربیت کا خواں تھا۔لیکن صبح کی نماز ادا کرنے کے بعد وہ اطمینان قلب کے ساتھ گھر کی جانب نکل پڑا۔ نئے سال کا سرما تھا۔ وہ شام کے وقت گھر پہنچ گیا۔سبھی لوگ اس کو دیکھ کر خوش ہو گئے۔صبح کے وقت وہ کتب خانے میں بیٹھا تھا کہ اس کی نظر پیڑ کی طرف اٹھی۔ وہاں کا خوبصورت منظر دیکھ کر اس کا دل خوش ہوا کیونکہ پیڑ پر پرندوں کے جوڑے کی چہچہاہٹ سے خوشی کا سماں بندھا ہوا تھا۔ ☆☆

پروفیسر افسانہ خاتون



عطر دان

بڑے بھیا کا فون کیا آیا کہ ایک سراسیمگی نے مجھے چاروں طرف سے گھیر لیا اور فوری طور پر میری سمجھ ہی میں نہیں آیا کہ اس خبر پر میں خوشی کا اظہار کروں یا..... افسوس کا اظہار تو کر نہیں سکتی تھی کہ میرا اکلوتا بھتیجا پہلی بار امریکہ سے آرہا تھا اور یہ بات یقیناً خوشی کی ہونی چاہئے تھی مگر..... حالات نے اتنے تضاد پیدا کر دیئے تھے کہ ایسے میں جان کا آنا ایک بوجھ ہی تھا۔ یہ کیفیت صرف میرے اندر تھی، گھر کے دوسرے لوگوں کو معلوم ہوتا تو وہ تو خوش ہی ہوتے۔ سات سمندر پار سے ان کا ایک قریبی رشتہ دار آرہا تھا تو وہ خوشی سے اچھل ہی تو پڑتے۔ یوں گھر میں کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ ایک اپنے مہمان کی خاطر داری کے پورے سامان موجود تھے، مگر وہ تو صرف میں ہی جانتی تھی کہ میں اس کے آنے سے کیوں پریشان ہوں۔

دراصل ہم لوگوں کا گھرانہ ایک دیندار ہے۔ دادا شہر کے مفتی تھے۔ والد صاحب بھی عالم تھے۔ بعد میں انہوں نے کالج، یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی اور ایک مقامی کالج میں لکچرر مقرر ہو گئے۔ یوں ان کی وضع قطع میں کوئی فرق نہیں آیا۔ بظاہر وہ ایک مولوی ہی نظر آتے تھے۔ انہوں نے اپنے بچوں کو ابتدائی دینی تعلیم دلوائی اور ان کی خواہش اسی لائن پر آگے بھی تعلیم دلوانے کی تھی۔ مگر نئے زمانے کی چکاچوند نے دکھائی نہ دینے والے اتنے دباؤ پیدا کر دیئے کہ ایک بندے کی خواہش اس کے سامنے بہت کمزور پڑ گئی تھی۔ ہم سب نے اسکول اور کالج میں تعلیم پائی۔ والد صاحب جدید تعلیم کے مخالف نہیں تھے، بس وہ حد سے باہر جانے کو پسند نہیں کرتے تھے۔ ہم لوگ ان کے جذبات کو سمجھتے تھے، لہٰذا انہیں ٹھیس پہنچانے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ اتفاق سے بڑے بھیا کو امریکہ سے ایک اسکالر شپ مل گئی۔ والد صاحب انہیں اجازت دینے میں ہچکچا رہے تھے، مگر بڑے بھیا اور ان سے زیادہ ہماری والدہ نے انہیں سمجھایا کہ امریکہ جا کر ہر شخص بے راہ رو نہیں ہو جاتا۔ پھر آپ نے اپنے بچوں کی ایسی تربیت کی ہے کہ ان کے قدم ڈگمگائیں گے نہیں، مطمئن رہئے۔ والد صاحب نے دو دن سوچنے کے لئے وقت مانگا، ان دو دنوں میں پتہ نہیں کیا کیا سوچ لیا کہ ان کے خاتمے پر انہوں نے ہم سب کو بٹھا کر سمجھانے کی کوشش کی، حالانکہ مسئلہ صرف بڑے بھیا کا تھا مگر وہ ہم سب کو اپنا پیغام دینا چاہتے تھے۔ انہوں نے گمبھیر لہجے میں کہنا شروع کیا۔

''میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا ہرگز مخالف نہیں ہوں۔ ہمیں تو حکم ہے کہ تعلیم حاصل کرنے کے لئے چین بھی جانا پڑے تو فوراً چلے جاؤ۔ میں دراصل وہاں کے ماحول اور بے تحاشہ روشنیوں اور رنگینیوں سے ڈرتا ہوں، یوں مجھے اپنی تربیت پر پورا اعتماد ہے۔ پھر بھی وہ ایک غیر ماحول ہے، اس کی اپنی قدریں ہیں جو ہماری قدروں سے بہت مختلف ہیں۔ زندگی گزارنے کے ان کے اپنے اصول اور قاعدے ہیں جو ہم سے بالکل میل نہیں کھاتے۔ وہاں جانے کا مطلب ہے، یا تو ان کے ماحول میں اپنے آپ کو ڈھال لینا، یا پھر ان کے درمیان بیگانگی کے ساتھ رہنا.....''

ابا دم لینے کے لئے رکے تو بڑے بھیا نے آہستہ سے کہا:

''مگر ابا! ہم تو وہاں رہنے کے لئے نہیں جا رہے ہیں، میرے سامنے ایک مقصد ہے جس کے تحت مجھے وہاں وقتی طور پر ان کے ساتھ رہنا ہے۔ بات یہ ہے کہ ان کے ہاں کی تعلیم کا معیار بہت اونچا ہے اور ہمارے ملک میں اس کی بہت قدر بھی ہوتی ہے.....''

بڑے بھیا کے الفاظ نے ابا پر خاصا اثر ڈالا۔ ان کے چہرے پر بشاشت دوڑ گئی۔

''خوشی ہوئی کہ تم ایک پختہ ارادے کے ساتھ وہاں جا رہے ہو۔ میں ڈرتا ہوں تو بس ایک بات سے.....''

ایسا محسوس ہوا کہ انہیں کسی ہچکچاہٹ نے روک دیا ہے۔ ہم لوگوں کو خاموش رہ کر اس کا انتظار کرنا تھا کہ وہ کب اس پر قابو پا کے آگے بڑھتے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ وہ بہت جلد پھر گویا ہوئے:

''دراصل وہاں کی بے حیائی اور بے شرمی سے مجھے خوف ہے، وہاں جس طرح عورت مرد کے درمیان خلط ملط ہوتا ہے، اس سے ڈرتا ہوں.....''

ابا کے صاف صاف کہنے پر اور پھر چپ ہو جانے پر ہم سب بھی خاموش رہ گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے ہی اس سکوت کو توڑا۔

''ابا! وہ بھی تو آسمانی کتاب کو ماننے والے ہیں اور ان سے تو شاید نکاح بھی جائز ہے.....''

کہنے کو تو میں نے کہہ دیا، مگر اس کے بعد میں اپنی بے باکی پر بے حد نادم ہوئی۔ شکر ہے، ابا نے اسے مثبت انداز میں لیا اور بولے۔

''سو تو ہے، اگرچہ انہوں نے اپنی کتابوں میں اتنی ترمیم و تنسیخ کر دی ہے کہ اوریجنل کتاب شاید باقی بھی نہیں رہی۔ دراصل ان کے دلوں میں ہمارے مذہب اور پیغمبر کے بارے میں اتنا تعصب بھرا ہوا ہے کہ وہ اس کا کبھی کبھی بھونڈے اظہار سے بھی نہیں چوکتے۔ اس کے علاوہ غور کرو کہ جس گھر میں غلطی سے بھی اللہ اور رسولؐ کا نام نہ لیا جائے اور لیا بھی جائے تو نہایت رکیک انداز میں، اور اپنے مذہب کی ہر دم تعریف کی جائے تو ایک بیچارہ

211، اے، رجنی گندھا، صداقت آشرم، پٹنہ۔10
فون: 7319879539
mrrizvi1965@gmail.com

تنہا بندہ کتنا جواب دے گا اور کہاں تک۔ آخر تو اس کا ذہن بھی دھیرے دھیرے متاثر ہوگا اور.....''

پتہ نہیں بڑے بھیا میں کہاں سے اتنی ہمت آ گئی کہ انہوں نے قدرے مضبوط اور کسی قدر جوشیلے انداز میں ابا کی بات کاٹی۔

''ابا! آپ یقین جانئے، آپ کے بال بچے آپ کو کبھی ٹھیس نہیں پہنچائیں گے، آپ نے ہم سب کی اتنی مضبوط تربیت کی ہے کہ ہم کبھی ہل بھی نہیں سکتے.....''

ابا کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تیرنے لگے اور انہوں نے بے ساختہ اٹھ کر بھیا کو گلے لگا لیا۔

لیکن ہوا یہ کہ ابا کی ساری نصیحتیں اور بڑے بھیا کے سارے وعدے دھرے کے دھرے رہ گئے اور بڑے بھیا کی آنکھیں دیار غیر کی رنگینیوں سے چکا چوند ہو گئیں اور وہ وہاں جا کر سب کچھ بھول گئے۔ شروعات میں تو ان کے فون اور خط تاکید سے آتے رہے، پھر آہستہ آہستہ یہ معاملہ دھیما ہوتا گیا، یہاں تک کہ بالکل معدوم ہو گیا۔ اب ہم بڑے بھیا کی خیریت جاننے کے لئے اپنے دور دراز کے رشتہ داروں کے محتاج ہو گئے، جو بہت پہلے وہاں جا بسے تھے اور جن سے ہمارا کوئی خاص رابطہ بھی باقی نہیں رہا تھا۔ اسی دوران پتہ چلا کہ بڑے بھیا ایک سفید فام لڑکی کی سنہری زلفوں کے اسیر ہو گئے، اس سے شادی کر لی، یوں ہمیں یقین نہیں تھا کہ انہوں نے باقاعدہ نکاح کیا ہوگا، ابا نے یہ خبریں صبر کے ساتھ سنیں اور بالکل گم صم ہو گئے اور ہر وقت عبادتوں میں غرق رہنے لگے۔ ہمارے گھر کا ماحول ایسا سوگوار ہو گیا تھا جیسے وہاں کسی جوان رعنا کی موت ہو گئی ہو۔ شاید یہ سچ بھی تھا۔ بڑے بھیا ہم سے ہمیشہ کے لئے چھوٹ گئے تھے۔ کڑھتے کڑھتے آخر ایک وقت ایسا آیا کہ ابا نے جان، جان آفرین کے سپرد کر دی۔ ان کے انتقال کے ٹھیک ایک مہینے کے بعد اماں بھی چل بسیں۔ گویا مصیبتوں نے یکے بعد دیگرے ہمارے ہنستے کھیلتے گھر کو اپنا نشانہ بنا لیا تھا۔ بڑے بھیا سے رابطہ ہی نہیں تھا، اس لئے ہم نے انہیں اطلاع بھی نہیں دی، ویسے انہیں خبر مل گئی تھی، اس قسم کی خبروں کو یوں بھی تیز رفتار پر لگ جاتے ہیں، مگر اس کے بعد بھی انہوں نے ہم سب کی سدھ بدھ نہیں لی اور ہم بھی ان پر صبر کر کے بیٹھ گئے۔

دور دراز کے رشتہ داروں سے رابطہ قائم ہو گیا تھا، بغیر دریافت کے ان سے بڑے بھیا کے بارے میں جانکاری ملتی رہی کہ اب وہ پوری طرح وہاں کی زندگی میں رچ بس گئے ہیں، ان کے بچے بھی ان کے اور اپنی ماں کے نقش قدم پر گئے ہیں۔ ان کے گھر میں اب اللہ و رسول کا کوئی غلطی سے بھی نام نہیں لیتا۔ البتہ عید میں ان کے ہاں پھیکی پھیکی سویاں بن جاتی ہیں اور بقرعید میں وہ ایک یہودی قصاب کے ہاں سے گوشت لے آتے ہیں جسے وہ بڑے شوق سے اپنے امریکن احباب کو کھلاتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ ہم ان کے بارے میں کچھ سننا بھی نہیں چاہتے تھے، مگر جانکاری دینے والے کو منع بھی نہیں کر سکتے تھے۔

میں نے سوچ رکھا تھا کہ کبھی بڑے بھیا کا فون آ گیا تو میں انہیں وہ سخت سست سناؤں گی جس کا انہوں نے تصور بھی نہیں کیا ہوگا۔ حالانکہ میرے تئیں یہ بدتمیزی ہوگی، مگر جب ان سے رشتہ ہی نہیں رہا، ماں باپ مر گئے، انہوں نے ایک آدھ فون سے بھی اپنے غم کا اظہار نہیں کیا تو اچھا ہے کہ وہ اب غیر ہی بن کر رہیں۔ لیکن جب ان کا فون آیا تو میں کچھ نہیں کہہ سکی، میرے منہ سے کچھ نکلا ہی نہیں، مجھے یاد ہی نہیں آیا کہ مجھے کیا کیا کہنا ہے۔ بس جی ہاں، ٹھیک ہے وغیرہ کہہ کے رہ گئی۔

ان کا بیٹا ایک طرح سے کرسچن ہی بن چکا تھا۔ ان کے گھر کا آزاد ماحول تھا، شاید بڑے بھیا نے سب کو چھوٹ دے رکھی تھی، ممکن ہے، انہوں نے خود بھی باپ دادا کا دین چھوڑ دیا ہو۔ ہمارے گھر میں تو دینی ماحول تھا، سبھی لوگ نماز پڑھتے، تلاوت کرتے اور دین ہی کی تہذیب پر چلتے تھے، ایسے میں جان کا آنا اور یہاں ٹھہرنا کس قدر کوفت کا باعث ہوتا، میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اتنے عیش و عشرت میں پلے ہوئے لڑکے کو یہاں اعلیٰ سے اعلیٰ ہوٹلوں کی کمی ہے کیا.....آخر کیا سمجھ کر بڑے بھیا نے اسے یہاں ٹھہرنے کو کہہ دیا۔ کیا وہ ہمارے گھر کے ماحول کو نہیں جانتے؟ بہر حال میں سوچتی رہی اور خیالات کے اتار چڑھاؤ سے گزرتی رہی۔ اب جو صورت حال سامنے آ گئی تھی، اس کا سامنا تو کرنا ہی تھا۔ میں نے بچوں کو جان کے آنے کے بارے میں اطلاع دی تو وہ خوشی سے اچھل پڑے۔ میں نے تھوڑی دیر انہیں خوش ہونے دیا، خوش ہونے کا انہیں حق تھا۔ آخر اپنا ایک سگا امریکہ سے آ رہا تھا اور وہ بھی دوسرے رنگ و روپ کا، پہلی بار ایک غیر ملکی، وہ بھی اپنا ہمارے گھر آ رہا تھا تو ان کا خوش ہونا واجب ہی تھا۔ پھر میں نے انہیں ساری باتیں سمجھائیں اور کہا کہ خیال رکھنا، وہ یہاں سے خوش خوش جائے۔ ان کے اور ہمارے طرز زندگی میں بہت فرق ہے۔ اس کے انداز و اطوار پر ہم کوئی اعتراض نہ کریں اور وہ ہماری کسی بات پر ٹوک ٹاک کرے تو اسے نظر انداز کر دیں۔ یہ بات ذہن سے نکال ہی دو تو بہتر ہے کہ وہ اپنے سگے ماموں کا بیٹا ہے۔ نہیں وہ اپنا نہیں رہا بس وہ ہمارے گھر میں ایک مہمان کی حیثیت سے آ رہا ہے اور مہمان کا احترام اور اس کی عزت ہمارا فرض ہے۔

جان کو ریسیو کرنے کے لئے ہم سب ایئر پورٹ گئے، ہم لوگ اسے پہچانتے نہیں تھے، لہٰذا بچوں نے اپنے ہاتھوں میں اس کے نام کی تختی تھام رکھی تھی۔ اچانک آنے والوں کی بھیڑ میں ایک زردی مائل امریکن نظر آیا جس کی مادری سفید رنگ کو پدری سانولے رنگ نے کافی حد تک دبانے کی کوشش کی تھی، جس کی وجہ سے نہ وہ بہت سفید رہا نہ بہت سانولا، بلکہ درمیان کی ایک چیز بن گیا تھا۔ اس کی بے چین، متلاشی نگاہیں بے چینی سے کچھ ڈھونڈ رہی تھیں، ہم سب نے اپنے ہاتھ اوپر اٹھا دیئے۔ وہ تقریباً دوڑتا ہوا ہماری طرف آ گیا اور نہایت گرم جوشی سے سب کے گلے ملا۔ اس سلسلے میں اس نے حفظ مراتب کا بھی خیال رکھا کہ پہلے میرے شوہر کے، پھر میرے گلے لگا، اس کے بعد بچوں کے۔ اس طرح لمحہ بھر میں اس نے ہماری اور اپنے درمیان کی دیوار گرانے میں کامیابی حاصل کی۔

وہ بے حد باتونی تھا۔ یہاں آنے پر اس کے انگ انگ سے جو خوشیاں جھلک رہی تھیں اور کچھ اپنے مزاج کے سبب وہ لگاتار بول رہا تھا، اگرچہ اس کے لب و لہجے سے اس کے مافی الضمیر تک پہنچنا ہمارے لئے بہت مشکل تھا۔ پھر بھی خلوص اور محبت کا اپنا ایک مافی الضمیر ہوتا ہے، وہ تو ہمارے اندر پہنچ ہی رہا تھا اور ہمیں بے حد محظوظ کر رہا تھا۔

جان آتے ہی ہم میں یوں گھل مل گیا جیسے ہم میں اور اس میں کوئی فرق ہی نہیں ہو۔ اگرچہ اس کی زبان اور اس سے زیادہ اس کا لب و لہجہ ہمارے لئے مانوس نہیں تھا۔ ہم اور ہمارے بچے انگریزی جانتے ضرور تھے، مگر جان کی انگریزی، ہماری انگریزی سے خاصی مختلف تھی اور لب و لہجہ تو بالکل ہی اجنبی تھا۔ پھر بھی اس کے ہاؤ بھاؤ سے، انداز و اطوار سے ہم اس کی بات بہت حد تک سمجھ ہی لیتے تھے، یوں بھی محبت کی اپنی ہی ایک زبان ہوتی ہے جس کا کوئی نام نہیں ہوتا، کوئی شکل و صورت نہیں ہوتی، کوئی قاعدہ قانون نہیں ہوتا، پھر بھی اس کی زبان کی ترسیل بہت آسان ہوتی ہے۔ جان کے ساتھ یہی معاملہ تھا، بہت ہی کم وقت میں اس نے محبت کے راستے ہمارے دلوں میں گھر کر لیا۔

ہم لوگوں نے اس کے رہنے سہنے، کھانے پینے کا جو

خصوصی اہتمام کیا تھا، وہ انہیں خاطر ہی میں نہیں لاتا تھا۔ ایک مخصوص کمرے میں اس کے لئے گدے دار بستر کا اہتمام کیا گیا تھا، بچے ایک بڑے کمرے میں چوکیوں کے ایک فرش پر ایک ساتھ سوتے تھے، وہ اپنا بستر چھوڑ کر وہیں سو رہتا۔ اس کے کھانے میں مصالحہ، مرچ وغیرہ نہیں ڈالے جاتے تھے، مگر وہ انہیں چھوڑ کر ہمارے مرچ اور تیز مصالحوں والے کھانے پر ٹوٹ پڑتا۔ چہرہ سرخ ہو رہا ہے، ناک اور آنکھوں سے پانی نکل رہا ہے، کانوں سے دھواں نکل رہا ہے، سوں سوں کر رہا ہے، پیشانی پر پسینے کے قطرے چمک اٹھے ہیں، رومال پر رومال بھیگ رہے ہیں، مگر کیا مجال کہ وہ اپنا ہاتھ روک دے۔ ہم لوگ اس کی اس کیفیت سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ اسے منع بھی کرتے مگر وہ تو الٹا اوپر سے مرچ نمک چھڑک لیتا، ایسا لگتا تھا کہ وہ انہی کھانوں کے لئے ہندوستان آیا ہے۔ شاید یہاں کے طرز زندگی اور کھان پان کا مطالعہ کر رہا ہے۔ ممکن ہے وہاں جا کر اس موضوع پر کچھ لکھ بھی ڈالے۔ بہر کیف، ہمارا تو وہ مہمان تھا اور اس کی دلجوئی کرنا ہمارا فرض۔

ایک دن دبی زبان سے اس نے کسی قریبی چرچ کا پتہ پوچھا۔ ظاہر ہے ہمیں کیا اعتراض ہوسکتا تھا، ہم نے بتا دیا تو وہ اگلے اتوار کو وہاں چلا بھی گیا۔ ہم نے بچوں کو منع کر دیا تھا کہ وہ اس سلسلے میں اس سے کوئی سوال نہیں کریں، مگر اس وقت ہماری حیرت کی انتہا نہیں رہی جب وہ بچوں کے ساتھ جمعہ کی نماز پڑھنے مسجد بھی چلا گیا۔ اس دفعہ بھی اس سے کوئی سوال کرنے کی ممانعت تھی۔ یوں اس کے پیچھے بچوں نے اس کے نماز پڑھنے کا جی بھر کے مذاق اڑایا۔ وہ حالت نماز میں ادھر ادھر تاک رہا تھا، وہ دوسروں کو دیکھ دیکھ رکوع، سجدہ کر رہا تھا، اس میں اس سے گنتی میں غلطی بھی ہو جاتی، دعا کے لئے ہاتھوں کو اس نے بڑی مشکل سے مخصوص طور پر اٹھانے کی کوشش کی تو ایک مضحکہ خیز صورت بن گئی۔ مجھے ہنسی تو آئی مگر میں نے انہیں ڈانٹا بھی کہ تم لوگ اپنی نماز چھوڑ کر یہی سب دیکھ رہے تھے۔

ہم محسوس کر رہے تھے کہ ہمارے ساتھ گھل ملنے کے چکر میں جان کبھی کبھی بہت مضحکہ خیز ہو جاتا ہے اور بچوں کی دلچسپی کا سبب بن جاتا ہے۔ بچے اس کی کچھ حرکتوں پر خوب ہنستے تھے اور اس کا مذاق اڑانے سے بھی باز نہیں آتے تھے۔ ہم لوگ بچوں کو منع بھی کرتے تھے کہ جان ہمارا مہمان ہے اور مہمان کا کبھی مذاق نہیں اڑانا چاہئے۔ مشکل یہ تھی کہ جان بھی ان کے ساتھ دل کھول کر ہنستا تھا اور ان کا مضحکہ اڑانے میں وہ بھی شامل ہو جاتا تھا۔ پتہ نہیں وہ ان باتوں کو سمجھتا بھی تھا یا نہیں۔

اس کے سلسلے میں ہم نے جو بھی تیاریاں کی تھیں، ان تمام خاطروں کو وہ خاطر ہی میں نہیں لاتا تھا، وہ ہماری طرح کھاتا پیتا، ہماری طرح رہتا سہتا اور ہم لوگوں کی صحبت کو وہ دل سے انجوائے کرتا تھا۔ ہم اسے باہر تفریح کے لئے لے جانے کی کوشش کرتے تو اس میں اس کی کوئی دلچسپی نہیں تھی، وہ ہمارے پرانے، معمولی گھر میں، جہاں یقیناً اس کے اپنے گھر جیسی سہولیات میسر نہیں تھیں بہت خوش خوش رہتا، گھر کی صفائی وغیرہ میں بھی وہ اپنا ہاتھ بٹانے کی پوری کوشش کرتا، جب کہ ہمارے اپنے بچوں کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ کبھی کبھی تو وہ ہمارے کچن میں بھی آ جاتا اور آلو پیاز کاٹنے لگتا اور اس چکر میں اس کی آنکھوں سے بے تحاشہ پانی جاری ہو جاتا، چہرہ سرخ ہو جاتا، مگر کیا مجال کہ وہ کچن سے چلا جائے۔ اس نے تو کچھ انڈین کھانا پکانا بھی سیکھ لیا تھا۔ ہندوستانی مصالحوں کے سلسلے میں اس نے خاصی جانکاری اکٹھا کر لی تھی اور انہیں خرید کر لے جانے کا ارادہ بھی رکھتا تھا۔

جان کے جانے کا وقت بھی قریب آ رہا تھا۔ ہم اسے کچھ تحفے دینا چاہتے تھے، مگر سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا دیں، اتنے دنوں میں اس کی کسی خاص چیز میں دلچسپی دکھائی نہیں دی تھی، یوں وہ ہر چیز میں دلچسپی رکھتا تھا، اس لئے ہمارے لئے فیصلہ کرنا بہت مشکل تھا۔ میرے بچوں نے رائے دی کہ اسے ایک جھولا نما رنگین شرٹ اور جگہ جگہ سے پھٹا ہوا، مسکا ہوا، بوسیدگی ظاہر کرتا ہوا جین دے دیا جائے، وہ اسی قسم کا لباس پہن کر آیا بھی تھا۔ حالانکہ ہمیں اتنا معمولی تحفہ دینے میں تامل تھا۔ دراصل اپنی سوچ کی دھارا میں ہم اس چلن کو لانے سے مجبور تھے جو اس وقت تقریباً پوری دنیا میں رائج تھا۔ بہت سوچنے اور بچوں کے زور دینے پر آخر ہمیں یہی کپڑے خریدنا پڑے، گو جین خاصا مہنگا تھا اور اس کی بوسیدگی اور جگہ جگہ سے پھٹی حالی بہت نمایاں تھی۔ ہم اسے خوبصورتی سے پیک کر کے لائے اور بڑے اہتمام سے جان کو پیش کیا۔ تحفہ پا کر جان کی آنکھیں چمک اٹھیں اور اس نے اسے ساتھ لے جانے کا بھی انتظار نہیں کیا اور ہمارے سامنے ہی پیک کا پیپر ہٹا دیا، مگر کپڑے دیکھ کر اس کی آنکھیں بجھ سی گئیں، وہ منہ سے کچھ نہیں بولا، مگر اس کا انداز صاف بتا رہا تھا کہ اسے پسند نہیں آیا، میرے منہ سے بے ساختہ سوال نکل گیا۔

''پسند نہیں آیا کیا.....؟''

جواب دینے میں وہ کچھ جھجکا، پھر آہستہ سے بولا:

''مجھے تو کھادی کے کرتے، پاجامے اور لکھنوی کرتے چاہئیں.....''

اس کی پسند پر ہمیں سخت حیرت ہوئی۔ ہمارے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ وہ خالص ہندوستانی عام کپڑے پسند کرے گا۔ بہر کیف وہ ہمارا مہمان تھا اور ہمیں اس کی پسند کا خیال رکھنا تھا۔ ہمیں خوشی بھی تھی کہ اس نے امریکن ہوتے ہوئے بھی ہمارے وطن کی مخصوص چیزوں کو پسند کیا تھا۔ ان کپڑوں کو پا کر وہ بہت خوش ہوا۔ اس کی خوشی برداشت کی سرحدوں کو پار کر گئی اور اس نے فوراً ان کپڑوں کو زیب تن بھی کر لیا اور خوش خوش ہمیں دکھانے لگا، پھر قد آدم آئینے میں ہر زاویے سے اپنے آپ کو دیکھا۔ واقعی یہ کپڑے اس پر بہت سج رہے تھے۔ سرخی مائل گورا تو وہ تھا ہی، لمبا اور متناسب جسم کا مالک بھی تھا۔ میں نے مسکرا کر کہا:

''تم تو ان کپڑوں میں کوئی شہزادے لگ رہے ہو.....''

اس نے بھی مسکرا کر فوراً جواب دیا۔

''انڈین پرنس.....!''

اس کی بے ساختگی پر ہم کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

کپڑے تو اس کی پسند کے ہم نے اس کو دے دیئے تھے، مگر ہماری تشفی نہیں ہو رہی تھی، اتنی دور سے اتنا قریبی رشتہ دار پہلی بار ہمارے ہاں آیا تو ہم نے اسے اتنے معمولی تحفے دے دیئے۔ اگرچہ اس کی پسند کے مطابق ہی دیئے تھے، پھر بھی ایک کسک سی تھی۔ اتفاق سے جس دن وہ جا رہا تھا، اس دن خود ہی اس نے ہماری کسک دور کر دی۔

ہمارے ڈرائنگ رام میں مینٹل پیس پر تاج محل کی شکل کا پیتل کا ایک عطر دان رکھا تھا اس پر اس کی نگاہیں بار بار پڑتی تھیں۔ ہم نے اس پر دھیان نہیں دیا۔ اس دن اس نے کھل کر اس کی فرمائش کر دی۔ وہ بھی کوئی غیر معمولی چیز نہیں تھی۔ ہم نے خوشی خوشی اس کے حوالہ کر دی، تب اس نے مسکرا کر کہا:

''عید کے موقع پر دوست یار آ جاتے ہیں تو ہم انہیں عطر نہیں پیش کر پاتے، سینٹ وغیرہ سے کام چلاتے ہیں۔ اب یہ رہے گا تو بہت اچھا لگے گا.....''

ہم سب اس کا منہ دیکھتے رہ گئے۔

☆☆☆

غزلیں

پی پی سریواستو رندؔ



بھٹکتی سوچیں، شکستہ لمحے، حصارِ غم کے غلام لکھے
جو لفظ ہجرت میں ہم نے لکھے، سفر پرستی کے نام لکھے
عجیب لذت شناس عالم تھا خوشبوؤں کی شناخت کرنا
دکاں لگائی تو ہم نے کانٹوں پہ، زرد پھولوں کے نام لکھے
روایتوں کو گلے لگا کر، نئی فضاؤں کی آرزو میں
پگھلتے موسم، بھٹکتی وحشت، صعوبتوں کے سلام لکھے
مرے بزرگوں کی جاہ و حشمت، لکھے جو شجرہ نویس کوئی
تمام رشتے ، تمام ناطے لکھے بصد احترام لکھے
کبھی سلگتے سے برف زاروں پہ ہم نے لکھی نئی کہانی
کبھی کپاسی پروں پہ ہم نے محبتوں کے پیام لکھے
اجڑتے موسم، سلگتی راتوں میں شغل یہ بھی رہا ہے میرا
کہ میں نے خوابوں کی تتلیوں پر لہو چھڑک کر پیام لکھے
بجھی بجھی سی گلاب رت میں دھنک سجائی تھی آسماں پر
فضا کے گمنام حاشیوں پر بھی رت جگوں کے پیام لکھے
وہ بے بسی ہو، کہ بے کلی ہو، کہ گھر میں بجھتی سی شعلگی ہو
تمام چیزوں پر رندؔ ہم نے، خود اپنے ہاتھوں سے دام لکھے

R-16، سیکٹر۔11، نوئیڈا (یوپی) 201301
فون: 9711422058

ڈاکٹر فریاد آزرؔ



ہاتھ اس کا تھا گزشتہ سال دائیں ہاتھ میں
آج تک ہے آتشِ سیال دائیں ہاتھ میں
اس قدر شدت سے رویا میں کہ بائیں ہاتھ سے
آ گیا خود نامۂ اعمال دائیں ہاتھ میں
مجھ کو آزادی کی وہ تحریک یاد آنے لگی
جب بھی دیکھا ریشمی رومال دائیں ہاتھ میں
بایاں بازو مدتوں تک ہاتھ ملتا رہ گیا
آ گیا جب مغربی بنگال دائیں ہاتھ میں
پھر تو وہ ظالم بھی بچ کر جا نہ پائے گا کہیں
آ گئی گر گردنِ دجال دائیں ہاتھ میں
جن کو سر کر لینے میں گزری ہے ساری زندگی
کچھ لکیروں کا ہے مایا جال دائیں ہاتھ میں
ختم کر دے گا جو نا انصافیوں کا اجتماع
اب بھی قائم ہے وہ استقلال دائیں ہاتھ میں
خون دشمن کا بھی ہم نا حق بہا سکتے نہیں
اس لئے رکھتے ہیں آزرؔ ڈھال دائیں ہاتھ میں

E11/73، حوض رانی، مالویہ نگر، نئی دہلی۔17
فون: 999 0 888 234

اخلاق آہن



سمندر کو پتہ ہے سب کوائف اپنے قطرے کے
مرا دل جس کے دستِ بیکراں میں ہے، وہ میں جانوں
ہوئی مدّت کہ پیتے ہیں اسی میخانہ و خُم سے
مگر اس بار سر جس سرگراں میں ہے، وہ میں جانوں
چھپا بیٹھا ہوں اور نظریں لگائے چشم و ابرو پر
جو اَب کے ناوکِ جاں کَن کماں میں ہے، وہ میں جانوں
نیا تو ہے نہیں یہ تجربہ وصل و وصالت کا
وہ اب اک لمسِ شیریں جو لَباں میں ہے، وہ میں جانوں
بہت ہے آرزوئے گفتگو، اظہارِ حالت کی
تڑپتا حرفِ مطلب اک زباں میں ہے، وہ میں جانوں
عبادتہائے مخفی، گریہ زاری، اشک افشانی
مگر اک بات جو شورِ اذاں میں ہے، وہ میں جانوں
یہ سب ہرزہ سرائی، گمرہی، آوارگی یک سو
مزہ جو سجدۂ دارِ بتاں میں ہے، وہ میں جانوں
بہت آتش فشاں دیکھے ہیں چشم و شورِ وجداں میں
مگر جو سوزشِ سوزِ دراں میں ہے، وہ میں جانوں
کہاں پھرتے ہو آہن جی لگائے، جی بجھائے سے
نہ پوچھو عالمِ دل جس فغاں میں ہے، وہ میں جانوں

شعبۂ فارسی، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی۔67
akhlaq.ahan@gmail.com

غزلیں

ف۔س اعجاز

اپنی ہی تصویر کھینچوں اپنی ہی صورت تکوں
جب کسی کو بھیج نہ پاؤں تو بولو کیا کروں
زندگی کا آخری دن لگ رہا ہے آ گیا
پھر بھی یہ خواہش ہے اُس کو ایک پل میں دیکھ لوں
خود سے دھوکہ کھانے والے کب جہاں میں کم ہوئے
جس پہ دنیا مرمٹی ہے، اُس پہ میں بھی مَر مٹوں
وہ کیا اُس کے لئے کہ خود نظر سے گر گیا
کیا کروں اب اور ایسا میں اُسے اچّھا لگوں
کس لئے احسان اٹھاؤں چاہنے والوں کا میں
اپنی ہی تربت کا اٹھ کر آپ میں پتھر ڈھکوں
اب کوئی خیرات لینے والا بھی سچّا نہیں
اے خدا اب تُو بتا کس ہاتھ پر سکّہ رکھوں
تجھ سے ملنا یوں ہے گویا زخم کو مرہم ملے
تجھ سے اپنے دکھ بتا کر دل کو ملتا ہے سکوں
دیکھتے ہی دیکھتے ساری عمارت گر پڑی
سارے رشتے دار نکلے برف کے اُجلے ستوں
اس لئے حیرت سے مجھ کو دیکھتے ہیں سب یہاں
شاید اس دنیا میں اپنے جیسا میں بس ایک ہوں
کوئی میری فیس بک کو ہی اڑا کر لے گیا
اب بتاؤ اپنی چوری کا میں قصہ کیا لکھوں
بات جس سے ہو رہی ہے سامنے آتا نہیں
اَون لائن الجھنوں پر اَون لائن رو پڑوں
بانس کے پیڑوں کی خوشبو اور کوئل کی صدا
جنگلوں میں میں ہوا کی سیٹیاں سنتا رہوں
ملک کی صورت بدل جاتی ہے تازہ خون سے
نوجوانوں کے لیے اچھا ہے تھوڑا سا جنوں
اس زمانے سے مجھے بھی کچھ تو میرا حق ملے
وقت کے نمکین آنسو کاش میں بھی پی سکوں
میرے نہ آنے سے تیرا دل جو ہو جائے اداس
تو کہے تو تجھ سے ملنے روز میں آیا کروں
تو مرا احساس اپنے تن بدن پر اوڑھ لے
دھوپ ہوں، بارش ہوں، یعنی موسموں کا ہار ہوں
اس لیے جاگا پڑا رہتا ہوں اتنی دیر تک
تو جو سوئے میں ترے رخسار پر بوسے لکھوں

25B، زکریا اسٹریٹ، کولکاتا۔700073
فون:9830483810

رضوان کشفی



نفس اک اک مہکتا جا رہا ہے
کوئی مجھ میں اترتا جا رہا ہے

جسے بھی دیکھئے شہرِ وفا میں
ترا ہی نام جپتا جا رہا ہے

جسے دل کا مکیں میں نے بنایا
وہ سانسوں سے الجھتا جا رہا ہے

ضرورت سے زیادہ کی طمع میں
جو کچھ ہے وہ بھی کھوتا جا رہا ہے

تمہارے ذکر سے میرا تکلم
نکھرتا ہی نکھرتا جا رہا ہے

مرے شعروں میں وہ جذبات بن کر
ابھرتا ہی ابھرتا جا رہا ہے

پذیرائی یہی کافی ہے کشفی
کوئی شعروں کو لکھتا جا رہا ہے

بابالے آؤٹ، ناگپور روڈ، تاڑی نگر، یاوت مل۔1
فون:9326057385

جوہر نوری



آنکھوں میں رنگ و نور کا منظر سمیٹ لو
جو دل کو دے سکون وہ پیکر سمیٹ لو

قطروں سے بجھ نہ پائے گی برسوں کی پیاس یہ
اے تشنہ کام آؤ سمندر سمیٹ لو

پتھر دلوں کو نرم نہ کر پاؤ گے کبھی
اشکوں کو اپنی آنکھوں کے اندر سمیٹ لو

آگے ہے رہزنوں کا ٹھکانہ یہ جان لو
اب قافلہ کو اے مرے رہبر سمیٹ لو

بڑھتے وہ آ رہے ہیں اندھیروں کے قافلے
تم اے اجالوں اپنا یہ دفتر سمیٹ لو

شیشے کے شہر میں یوں رہے ہو تو رہو
لیکن جہاں بھی دیکھ لو پتھر سمیٹ لو

مسجد میں ہونے والی ہے جوہرؔ اذانِ صبح
اب تو خدا کے واسطے بستر سمیٹ لو

محلّہ چودھرانہ، نزد مسجد، آرہ، ضلع بھوجپور، بہار۔802301
فون:07488259731

غزلیں

قیصرالہٰ آبادی



کسی کا دلربا، دلبر نہیں ہوں
کوئی ہنگامۂ محشر نہیں ہوں

میں اک شاعر ہوں، سوداگر نہیں ہوں
سخن پرور ہوں، پیشہ ور نہیں ہوں

ادب کی بزم میں یہ تالیاں کیوں
میں کلکتّے کا جادوگر نہیں ہوں

سخن سنجوں کی اپنی انجمن ہے
وہاں جاؤں مگر برتر نہیں ہوں

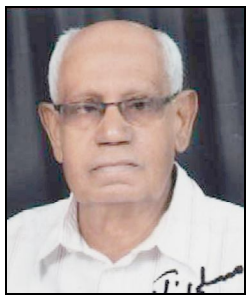
سیاست سے مجھے اللہ بچائے
کسی تنظیم کا ممبر نہیں ہوں

بُرا ہے اِس زمیں پر صف بچھانا
میں اپنے وقت کا بابر نہیں ہوں

کہوں کیا اب غزل ستّر برس میں
وہ سترہ سال کا قیصرؔ نہیں ہوں

فون:9560476576
muslimkhan660@gmail.com

مسلم نواز



خود اپنے آپ کو جب آنکھ بھر کے دیکھ لیا
تو اپنی ذات کو آئینہ کرکے دیکھ لیا

تمام نظریں اٹھیں مجھ کو دیکھنے کے لیے
جب اپنے آپ کو اخبار کرکے دیکھ لیا

ہر ایک سانس پہ لکھا تھا اس نے نام مرا
تو اس کے دل میں بھی اک دن اتر کے دیکھ لیا

ہر ایک ہاتھ کے پتھر پہ نام میرا تھا
گلی سے اس کی جو میں نے گزر کے دیکھ لیا

کوئی شخص فرشتہ صفت ملا ہی نہیں
میں آسماں سے زمیں پر اتر کے دیکھ لیا

کسی کی یاد میں جی کو سکون جب نہ ملا
تو اس کی یاد میں اک بار مر کے دیکھ لیا

نظر سے اپنا ہی پیکر تراشتا ہوں نوازؔ
کہ رکھ کے آئینہ خود ہی سنور کے دیکھ لیا

بیت القاسم 12/3/H/1، پٹوار بگان لین، کولکاتا۔700009
فون:8420850620

ڈاکٹر محمد داؤد نور

ہمارے عزائم

'کووڈ 19 پر قابو پانے کے بعد'

طوفاں جو سر پہ آیا تھا آکر گزر گیا
اب پھر نئی بہار کا ساماں کریں گے ہم

اس امن کی فضا میں نہ بیٹھیں گے چین سے
ظلمت جہاں بھی ہوگی چراغاں کریں گے ہم

چھیڑیں گے ساز پھر وہی الفت کا پیار کا
اُفتاد جو بھی آئے گی آساں کریں گے ہم

پھر لوٹ کر نہ آئے یہ کلفت یہ تیرگی
امن و سلامتی سے وہ پیماں کریں گے ہم

مجبوریوں کا نام نہ لیں گے کسی طرح
سعی و جہد کو اور نمایاں کریں گے ہم

اپنا دیار، اپنی زمیں، اپنا آسماں
ہر ایک شے کو رشکِ گلستاں کریں گے ہم

ٹوٹے ہوئے دلوں کو ملائیں گے پھر سے ہم
ہو درد چاہے جیسا بھی درماں کریں گے ہم

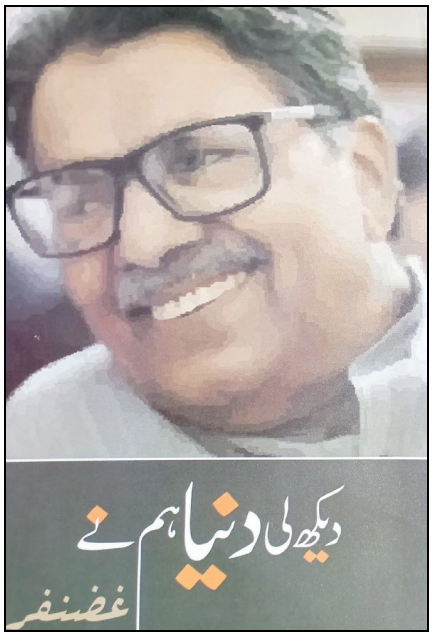
ہو جائیں پھر سے نورالعُلیٰ نوؔر فضائیں
کچھ اس طرح سے نور کا ساماں کریں گے ہم

ملتانی کلینک، لوہاری سرائے، نگینہ
فون:9927721564

تبصرے

☆ تبصرے کیلئے کتاب کی دو کاپیاں لازماً ارسال کریں۔
☆ ضروری نہیں کہ ہر کتاب پر تبصرہ شائع ہو۔
☆ تبصرے کے لیے ارسال کی جارہی کتاب کے سرورق کی تصویر ای میل سے بھیجیں۔
☆ تبصرے کے لیے تقاضا کر کے شرمندہ نہ کریں۔
☆ کتاب کسی بھی صورت میں واپس نہیں کی جائے گی۔

نام کتاب : دیکھ لی دنیا ہم نے
مصنف : غضنفر
ضخامت : 336 صفحات
قیمت : 350 روپے
پبلشر : عرشیہ پبلی کیشنز
مبصر : دائم محمد انصاری
فون : 8777834566



غضنفر صاحب نے اپنی تازہ وارد ناول نما خودنوشت کے آغاز میں ہی یہ بات واضح کردی ہے کہ:

''عقل پرست انسانی زندگی بھی کبھی کبھی ایسے موڑ سے گزرتی ہے کہ ہونی انہونی لگنے لگتی ہے۔ جو کچھ ہوا، لگتا ہے ویسا نہیں ہوا ہوگا۔ یا ویسا ہو ہی نہیں سکتا اور اسی لئے جو کچھ ہوا خود اپنی نگاہ میں بھی غیر معتبر ٹھہرنے لگتا ہے۔ اسی لئے میری زندگی کے ایک مخصوص دور میں جو کچھ ہوا اور جس طرح ہوا، بغیر کسی عقلی جانچ پرکھ کے میں اسے لکھتا چلا گیا اور جب لکھ گیا تو لگا کہ کارجنوں کا سلسلہ آگے تک جاتا ہے اور اس جنوں کے دھاگے میں دوسرے سودوں کے سرے بھی جڑتے ہیں۔'' (آغاز قصہ، ص:7)

یہاں سے قارئین کے لئے مطلع صاف ہوجاتا ہے کہ وہ اس کتاب کو محض خودنوشت سمجھ کر نہ پڑھیں بلکہ دشت جنوں کی سیاحت روی کی نظروں سے پڑھیں۔ کیونکہ ایک خودنوشت میں، خواہ وہ کتنے ہی اچھوتے انداز میں لکھی گئی ہو، کسی کو کیا دلچسپی ہوسکتی ہے تاوقتیکہ اس میں انفرادیت کے ساتھ ساتھ اجتماعیت کا تاثر بھی حلول نہ کر جائے اور قاری کا راوی کے ساتھ وہی انسلاک ہو جو راوی کا اپنی داستان حیات سے ہے۔

ان ابتدائی کلمات کے بعد آیئے اب کتاب کے اوراق پلٹتے ہیں۔

'شہاب نامہ'، 'ورود مسعود' اور 'خواب باقی ہیں' جیسی خود نوشت پڑھ کر مجھ کم علم کی سمجھ میں یہی آیا تھا کہ خودنوشت کا آغاز کچھ اسی طرح ہونا چاہئے کہ 'میری پیدائش فلاں وقت پہ فلاں مقام پر ہوئی، میرے والد صاحب کا نام یہ تھا، کم عمری سے ہی مجھے لکھنے پڑھنے کا شوق تھا، وغیرہ وغیرہ، اور غالباً یہی وجہ تھی کہ ان گرانقدر ہستیوں کی روداد زیست کی قرأت چند صفحات سے زیادہ کرنی مجھے اکثر دشوار معلوم ہوئی۔ لیکن جو چیز غضنفر صاحب کی خود نوشت کو دوسری کتب سے ممیز کرتی ہے وہ بلاشبہ اس کا افسانوی آغاز ہے جس میں راوی ایک مجنونانہ حلیہ میں ہمارے سامنے نمودار ہوتا ہے۔ حالانکہ یہ افسانوی ترنگ ابتدا تا انتہا ہمیں ایک ہی خط پر ابھرتا نظر نہیں آتا بلکہ قصہ کی شروعات کے بعد اکثر مقامات پر ہمیں خاکہ نگاری اور رپورتاژ کی سی کیفیت کا گمان ہوتا ہے، لیکن باوجود اس کے چونکہ کہانی کی ابتدا کہانی کے پیرائے میں ہی کی گئی ہے اس لئے قاری کے ذہن کی ڈور خواہ مخواہ اس بات سے جا الجھتی ہے کہ اب آگے کیا ہوگا اور سچ پوچھئے تو یہ تجسس ہی کتاب کو از خود پڑھوائے چلا جاتا ہے حتیٰ کہ کتاب تمام ہوجاتی ہے۔ یوں لگتا ہے (گرچہ واقعتاً ایسا ہے نہیں) کہ شہرزاد، شہریار کی پائینتی بیٹھے داستان گوئی کر رہی ہو اور ہر ایک قصے کے اختتام پر شہریار پوچھ اٹھتا ہے کہ 'آگے کیا ہوا'۔ غضنفر اس بات کو بخوبی سمجھتے ہیں کہ قاری کی دلچسپی کے لئے خودنوشت جیسی روکھی پھیکی کتاب کا 'انداز بیاں اور' ہونا چاہئے ورنہ اپنے وسیع حلقے کی بدولت ان کی یہ کتاب تو بہت سارے احباب تک پہنچ جائے گی لیکن ان کی داستان حیات شاید ہی کسی تک پہنچے۔ قصہ کے آغاز (پہلے پیراگراف) کا انداز بیاں ملاحظہ کریں:

''میں جس حلیے میں گھر کے اندر تھا اسی حلیے میں باہر نکل پڑا تھا۔ بغیر کسی سے ملے، بنا کسی کو کچھ بتائے ماموں کی بیٹھک سے نکل کر میں سیدھے سیوان ریلوے اسٹیشن پہنچ گیا۔ نیم بدحواسی کے عالم میں کیے گئے اس سفر پر اب جب غور کرتا ہوں تو لگتا ہے کہ میرا یہ ناگہانی سفر ضرور کسی اضطراری کیفیت کے دباؤ کا نتیجہ تھا اور یہ سمجھ میں آتا ہے کہ قربتوں میں جب دوریاں در آتی ہیں تو در و دیوار ڈرانے لگتے ہیں اور توقع کی لو جب بجھتی ہے تو رشتوں سے دھواں اٹھنے لگتا ہے اور یہ دھواں ایسا دیز اور دم سوز ہوتا ہے کہ اس کے گھنے گھیرے میں کھڑا ہونا دوبھر ہوجاتا ہے۔''

مذکورہ بالا اقتباس کے کلیدی الفاظ 'اضطراری کیفیت کا دباؤ'، 'قربتوں میں دوریاں در آنا'، 'توقع کی لو کا بجھنا' اور 'رشتوں سے دھواں اٹھنا' ہیں جن سے نہ صرف اس خودنوشت بیانیہ کا مومنٹم سیٹ ہوتا ہے بلکہ انہی کلیدی الفاظ کی بازگشت آگے چل کر کئی ایک مقامات پر ہمیں سنائی دیتی ہے۔

زیر نظر کتاب کی نمایاں خصوصیات میں ایک وصف یہ بھی ہے کہ یہ یونیورسٹی میں تقرری، پروفیسروں کے مابین آپسی تعلقات، مدرسین و یونیورسٹی انتظامیہ کے درمیان آپسی روابط نیز تدریسی ملازمت سے متعلق کئی ایک تکنیکی موضوعات پر بے لاگ گفتگو کرتی ہے۔ ایسی گفتگو جس کا اس کتاب میں در آنا قرین قیاس نہیں تھا لیکن جس سے صرف نظر بھی مناسب نہیں تھا اور اس کا کیا کیجئے کہ متنازع بیان اور حیرت انگیز انکشافات بھی تو خودنوشت کے اوصاف میں شمار ہونے لگے ہیں۔

'دیکھ لی دنیا ہم نے' اس لحاظ سے ایک اہم دستاویز ہے کہ یہ ہمارے عہد کے ایک سربرآوردہ ادیب کی زندگی کی داستان بیان کرتی ہے۔ یہ نہ صرف ہمیں اس کی نگاہوں سے ہمارے آس پاس کی دنیا کا نظارہ کراتی ہے بلکہ اس کے طرز حیات اور افکار و نظریات سے بھی ہمیں متعارف کراتی ہے جس سے ہمیں مصنف کے خلاقانہ ذہن کو سمجھنے کے ساتھ ساتھ اس کی تخلیقات کو بھی سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ مثلاً اپنے پہلے ناول 'پانی' کے لکھنے کے پس منظر کو مصنف نے واضح لفظوں میں یوں بیان کیا ہے کہ:

''پانی کی کمی، پانی کی رفتار، پانی کی ہوڑ، پانی کے لئے توڑ پھوڑ، پیاس، اضطراب اور مارا ماری پر جب میں نے غور کرنا شروع کیا تو نل کے پاس دکھائی دینے والا مسئلہ دور دور تک نظر آنے لگا۔ میرے سامنے والے نل سے کتنے ہینل جڑتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ اس سے شیر ساگر اور چشمۂ خضر بھی آ جڑے۔ ان تمام نلوں

اورمنبعوں کا جڑنا تھا کہ پانی سے ''پانی'' نکل آیا اور پانی، پیاس اور پیاسے کی کہانی کے ساتھ ساتھ انسانی ضرورتوں ،ضرورتوں پر پہروں اور پہروں کے پیچھے کے پردوں کا استعارہ بن گیا۔''

(ص:190)

یہ دنیا انسانوں کا ایک عظیم الشان سمندر ہے۔اس سمندر کا لوگ دور ہی سے نظارہ کرتے ہیں اور خوش ہو لیتے ہیں ۔بہت کم ایسے ہیں جو اس سمندر میں اپنی ناؤ اتارتے ہیں اور موجوں کے زیر و بم ،طوفان اور بھنور سے خود کو صاف بچاتے ہوئے نہ صرف سمندر کی بے تکلف سیر کرتے ہیں بلکہ واپس کنارے پر آ کر اپنے سفر کی کہانیاں مزے لے لے کر سناتے ہیں۔زیر نظر کتاب ہمارے عہد کے ایک ایسے مانجھی کی داستان ہے جس نے نہ صرف پانی میں اپنی ناؤ بغیر پتوار کے اتاری (ورنہ ملازمت جانے کے وقت شادی کرنے کا حوصلہ کتنوں میں پایا جاتا ہے) بلکہ ایک مشاق ملاح کی طرح سمندر کے طول وعرض کو بھی ناپا اور کسی فاتح کی طرح ساحل پر وارد ہوا۔'دیکھ لی دنیا ہم نے' ایسی ہی ایک اوڈیسی کا بیانیہ ہے جس میں یونانی دیومالائی کہانی جیسا رنگ اور مشرقی داستانوں جیسا لطف ہے۔اس میں غزل کی سی خفیف نزاکت کے ساتھ ساتھ افسانوی حسن پوری آب وتاب کے ساتھ جلوہ گر ہے اور اپنے عنوان کے برخلاف کتاب کا اختتام دبی زبان سے جیسے ہمیں یہ باور کراتا ہو کہ 'سفر ابھی باقی ہے'۔

نام کتاب :مٹی کے موسم

مصنف : بلراج بخشی

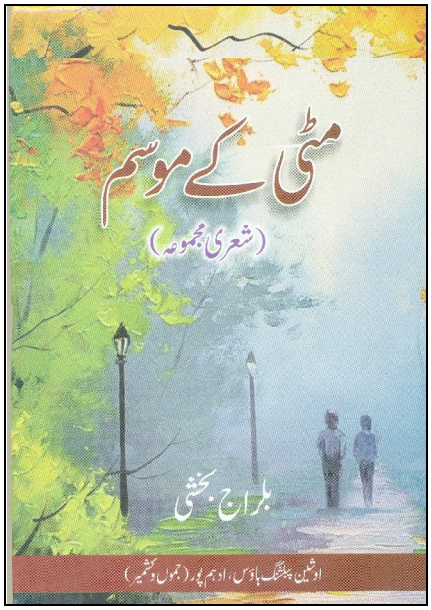
ضخامت : 202 صفحات

قیمت : 300 روپے

ناشر : اوشین پبلشنگ ہاؤس ادھم پور (جموں وکشمیر)

مبصر : حبیب سیفی

اُردو دوستی بھی کسی سے کیا کچھ کرا لیتی ہے یہ دیکھنا ہے تو حقیقی معنوں میں غیر اردو داں ،مگر ایک مخلص اردو دوست سے ملئے تو آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ دوستی کتنی قربانیاں لیتی ہے۔عہد حاضر میں اب آپ بلراج بخشی کو ہی دیکھئے نثر بھی لکھتے ہیں اور نظم بھی ،غزلیں بھی ،تحقیق وتنقید بھی فکر کا حصہ بننے لگی ہے،لغت نویسی میں بھی ایک مثالی کام کر چکے ہیں،لیکن فی الوقت آپ کا شعری مجموعہ زیر نگاہ ہے۔شاعری میں بہت ہی کم ایسی کتابیں منظر عام پر آ رہی ہیں جو فکر کو مہمیز کریں اور ان سے نظر کو بالیدگی عطا ہو۔بلراج بخشی کی شاعری کا یہ مجموعہ پہلی ہی نظر میں کسی بھی سنجیدہ قاری کو اپنی جانب مائل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔غزلوں اور آزاد نظموں پر مبنی مجموعہ میں آپ نے اپنی علمی وفنی کارگزاریوں سے جس قدر استفادہ کرتے



ہوئے شاعری کی ہے اس کی جس قدر تعریف کی جائے کم ہے،نئی اور تازہ شاعری کے تقریباً تمام موضوعات بلراج کے شعور کا حصہ بنے ہیں۔مثال کے طور پر:

وقت نے شرط نئی کردی ضروری بلراجؔ
روز جینے کے لئے روز ہی مرنا ہے مجھے

سنا کسی نے تو بچ جائے گا وجود مرا
بکھر رہا ہوں میں صحراؤں میں صدا کی طرح

آج کل کچھ بھی سلیقے سے نہیں ہوتا ہے
دل کہیں اور دماغ اور کہیں ہوتا ہے

بلراج بخشی حکومت جموں وکشمیر نے 'جموں کشمیر اسٹیٹ ایوارڈ' سے سرفراز کیا ہے۔آپ جموں وکشمیر کے پہلے اردو ادیب ہیں جنہیں مرکزی وزارت ثقافت نے سال 2007 میں فیلو شپ سے نوازا تھا ۔ہم یہاں آپ کے انعام واکرام اور اعزازات کی فہرست نہیں گنا رہے ہیں،بس کہ اشارہ تھا،سو کر دیا،بتانا مقصود یہ ہے کہ بلراج بخشی اُردو کے ایسے قلمکار ہیں جن پر آنے والی نسلیں یقیناً فخر محسوس کریں گی۔

نظم نروان

میں اس نسل کا آخری آدمی ہوں
مرے سامنے دونوں تابوت ہیں
ماضی وحال کے
ان پہ لکھا ہوا سارا افسانۂ ارتقا، فلسفہ،
ساری تہذیب کا مرثیہ،
مضمحل آرزوؤں کی تضحیک بھی،
اس زمیں کے تقدس کی تذلیل بھی،
سب مرے سامنے ہے میں سب جانتا ہوں۔

شاعری کے متعلق اگلے وقتوں میں قیاس آرائیاں، قیافہ خوب ہوئے،اپنے اپنے نظریات بھی پیش کیے ، ایسا کرنے والوں کی بڑی تعداد ہے۔اصل شاعری اپنے اردگرد پھیلی ہوئی دنیا کو گہری نظر سے دیکھنے،قوت تخیل سے اس میں رنگ آمیزی کرنے اور پھر لفظوں میں اس کی ہو بہو تصویر اتار دینے کا نام ہے۔بلراج بخشی کی مٹی کے موسم کی جملہ شاعری اس قول پر صادق اترتی ہے۔ملاحظہ کریں یہ اشعار:

ہماری آبلہ پائی کا صدقہ
جو ہم ہیں خار زاروں کے حوالے

شکھ میں رکھ لیں اذانیں میں نے
تم نمازوں میں شوالے رکھنا

میرا بھارت مہان ہے۔بھارت کی ایکتا ہی دنیا میں بھارت کی پہچان ہے۔توقع ہے اغلاط سے پاک صاف ستھری طباعت اور دلکش ٹائٹل کی بدولت بلراج بخشی کی دیگر کتب کی طرح آپ کا یہ شعری مجموعہ بھی ادب نوازوں کی پسند بنے گا۔

نام کتاب : مجھے بھی (افسانے)

مصنفہ : غزالہ قمر اعجاز

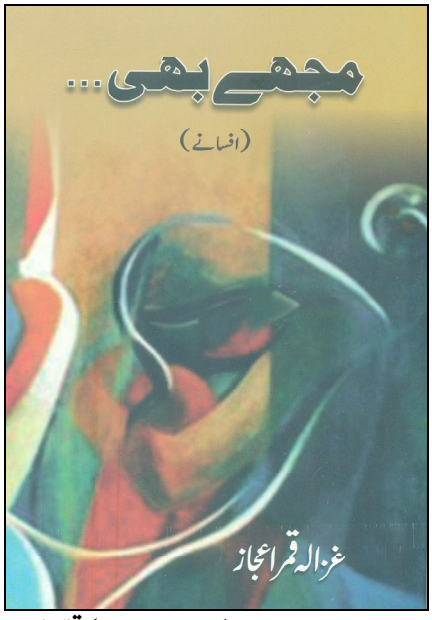
ضخامت : 195 صفحات

قیمت : 300 صفحات

ناشر : ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی۔6

مبصر : ڈاکٹر ظفر عالم (خالد ظفر)

فون : 9935212009



زیر تبصرہ کتاب ''مجھے بھی'' غزالہ قمر اعجاز کی تخلیق کردہ افسانوی مجموعہ ہے۔جس میں 26 افسانے شامل ہیں ۔اس کتاب کی تمام تر کہانیاں ہمارے آس پاس کے ماحول کی ترجمانی کرتی نظر آتی ہیں۔کتاب کے مطالعے کے بعد واضح ہوتا ہے کہ موصوفہ نے چابک دستی اور فنکارانہ طریقے سے تمام

کہانیوں کا تانا بانا بنا ہے۔کتاب میں شامل پہلا افسانہ ''تنگ ہوتی زمین'' ایک بچے اور ایک بوڑھے شخص کے سہارے آگے بڑھتی ہے۔قاری کو یہ کہانی حالات حاضرہ کی بھرپور منظر کشی کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔دوسرا افسانہ ''سرگوشی'' عورت کی نفسیات پر مبنی ایک بہترین کہانی کہی جاسکتی ہے۔موصوفہ نے ایک عورت مرد کی ازدواجی زندگی میں رونما ہونے والے واقعات کی اچھی منظر کشی کی ہے۔'تکمیل' کو اردو فکشن کے عمدہ افسانوں کی صف میں شامل کیا جاسکتا ہے۔جس میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ عورت کسی سے عشق کرتی ہے تو تاحیات اسی پر فریفتہ رہتی ہے۔افسانہ ''مجھے بھی'' جو کہ مجموعے کا عنوان بھی ہے۔اس افسانے کی ایک ایک سطر درد و کرب کی غماز کہی جا سکتی ہے، یہ افسانہ ایک عورت اور اس کی بیٹی پر ہونے والے ظلم کی کہانی پر مبنی ہے۔'مائی اور ماتا' ایک الجھا ہوا افسانہ کہا جاسکتا ہے، قاری افسانے کی نبض تک پہنچتے پہنچتے بوریت محسوس کرتا ہے۔'کنگھا' افسانے میں ایک عورت کے ایثار و قربانی کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔اس افسانے کو پڑھتے وقت قاری کو یہ احساس ہوتا ہے کہ ایک ماں اپنے بچے کے لیے اپنی تمام خوشیوں کو قربان کرسکتی ہے۔''جسم سے پرے'' نورن اور اس کی غریب ماں پر مبنی افسانہ ہے۔نورن کردار کے ذریعے مصنفہ نے سماج کے ان باوقار چہروں کا راز فاش کیا ہے جنھیں سماج بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔'بگی' حالیہ دنوں میں پھیلی وبا کورونا وائرس کا سہارا لیتے ہوئے غزالہ قمر اعجاز نے اس کہانی کا تانا بانا بنا ہے۔انھوں نے ایک غریب اور مفلوک الحال عورت اور اس کے بچے کے ذریعے سماج کے مختلف طبقوں کی نقاب کشائی کی ہے۔کورونا وبا سے پہلے اس غریب عورت کو اپنے اور اپنے بچے کے پیٹ بھرنے کے لیے کتنی اذیتیں برداشت کرنی پڑیں اور جب یہ وبا عام ہوگئی اور جو لوگ اس کا استحصال کرنے پر آمادہ رہتے تھے وہی اس سے دور رہنے کی تلقین کرنے لگے۔'عورت کا دھرم' دو سہیلیوں کی روداد پر مبنی افسانہ ہے۔اس افسانے میں غزالہ اعجاز قمر نے مشرقی معاشرے اور ایک مشرقی عورت کی عکاسی بڑی خوبصورتی سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے'کل اور آج' موجودہ دور کی ترجمانی کرتا ہوا افسانہ ہے۔مذکورہ افسانوں کے علاوہ اس افسانوی مجموعے میں 'نعمت خانہ'، 'پھانس'، 'مٹی کا بٹوا'، 'گاؤ تکیہ'، 'ماں بکتی ہے'، 'اندھیرا'، 'دیوڑھی'، 'لفافہ'، 'چھت کے اوپر چھت'، 'کھرنڈ' کے نام سے افسانے شامل ہیں۔

بہرکیف غزالہ قمر اعجاز کے افسانوی مجموعے کا مطالعہ کرنے کے بعد سعادت حسن منٹو کا یہ قول جوراجندر سنگھ بیدی کے متعلق ہے یاد آتا ہے کہ ''تم سوچتے بہت ہو لکھنے سے پہلے سوچتے ہو بیچ میں سوچتے ہو اور بعد میں بھی سوچتے ہو'' وہی بات یہاں بھی صادق آتی ہے۔موصوفہ نے اس کتاب کے افسانوں کی ایک ایک سطر کو بہت سوچ سمجھ کر اور غور و فکر کے بعد لکھا ہے۔ان کے افسانوی کردار وں کو اپنے ماضی سے گہرا تعلق ہے۔ان کی ابتدا تو حال سے ہوتی ہے لیکن کچھ ہی دیر میں وہ اپنے ماضی اور اپنی مشرقی روایت میں اس طرح گم ہو جاتے ہیں کہ چاہ کر بھی وہ ماڈرن دور سے رشتہ استوار کرنے میں ناکام نظر آتے ہیں۔شاید اس لیے کہ زمانہ مادیت کی ہوڑ میں بہ ظاہر ترقی کر رہا ہے لیکن اصل زندگی میں وہ تنزلی کی طرف گامزن ہے اور میرے خیال میں غزالہ قمر اعجاز اپنے افسانوں کے ذریعے سماج کو ایک مثبت پیغام دینا چاہتی ہیں۔جہاں خوشی ہو، امن ہو، بھائی چارہ ہو اور قومی یکجہتی ہو۔بڑے وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ ان کا یہ افسانوی مجموعہ قارئین کو ضرور متوجہ کرے گا۔

نام کتاب : پرواز

شاعر : جمشید کمال

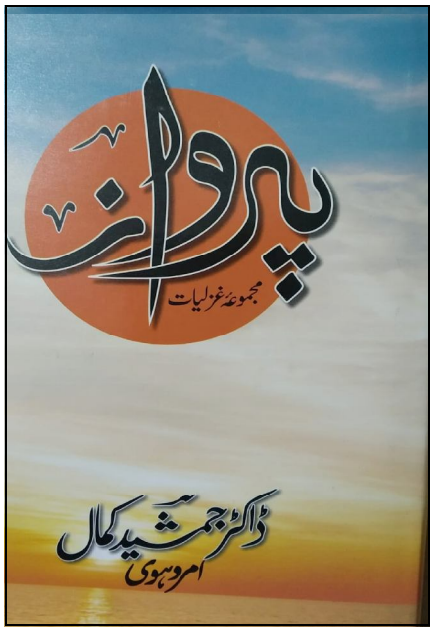
ناشر : کمپیوٹائپ میڈیا۔نئی دہلی

ضخامت : 249 صفحات

قیمت : 250 روپے

مبصر : جمال عباس فہمی

فون : 9392522121



زیر تبصرہ کتاب 'پرواز' جمشید کمال امروہوی کا پہلا شعری مجموعہ ہے۔'پرواز' ایک حمد، ایک نعت، 81 غزلوں اور 9 نظموں پر مشتمل جمشید کمال کی فکری جولانیوں کا مرقع ہے۔ اس شعری مجموعے کی خصوصیات اور شاعر کی فکری اساس پر بات کرنے سے پہلے صاحب مجموعہ کے بارے میں جاننا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔جمشید کمال امروہہ کے ایک خوش شکل، خوش لباس، خوش سیرت اور ایک خوش فکر شاعر ہیں۔وہ شہر کی ایک قدیم اور تاریخی علمی درسگاہ آئی ایم انٹر کالج کے پرنسپل ہیں۔انگریزی اور اردو ادب میں پوسٹ گریجویٹ ہیں۔انہوں نے تاریخ میں بھی ایم اے کیا ہے۔جمشید کمال نے 'مراثی جوش کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ' کے موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی ہے۔انہوں نے پروفیسر ڈاکٹر سیادت نقوی کی نگرانی میں اپنا تحقیقی مقالہ تحریر کیا۔

پروفیسر منظر عباس نقوی، پروفیسر ہلال نقوی، پروفیسر اختر الواسع، پروفیسر ناشر نقوی، پروفیسر عباس رضا نیر اور پروفیسر اسلم جمشید پوری نے جمشید کمال کی شاعری، ان کے فن، ان کی فکری اساس، اسلوب، طرز بیان اور انداز نگارش پر جو کچھ تحریر کیا ہے اس کا نچوڑ اگر میں لکھوں تو یہ ہوگا کہ جمشید کمال عصری حسیت کے شاعر ہیں۔ان کی شاعری روایتی عشق اور رندی کے مضامین سے پاک ہے۔جمشید کمال بڑی بصیرت کے ساتھ مذہب کی حقانیت اور انسانیت کے لئے اس کی تعلیمات سے اکتساب فیض کرنے والے قلمکار ہیں۔ان کی شاعری میں جو انسانی رویہ نظر آتا ہے وہ اپنے رشتوں کے تمام دکھ سکھ کے ساتھ محو سفر ہے۔ان کی غزلوں میں روایتی معشوق ندارد ہے اور جب معشوق نہیں ہے تو لب و رخسار کا ذکر نہیں ہے۔ہجر و وصال کا بیان نہیں۔ان کی شاعری میں زندگی کی مقصدیت نمایاں ہے۔اردو شاعری سے عشق کرنے والوں کو جمشید کمال کی شاعری میں روایتی مے کی جگہ اپنے احساس اور تخیل کی آنچ سے کشید کی ہوئی شراب ملے گی۔جمشید کمال کی شاعری میں ایسا فنکار نظر آتا ہے جو زمانے سے شاکی تو ہے لیکن بہتر مستقبل کی آس میں امید کا دامن نہیں چھوڑتا۔وہ اپنے شعروں کے وسیلے سے حق و باطل کی تمیز بھی واضح کرتا ہے۔وہ سماج کی حقیقی تصویر پیش کرتا ہے۔جمشید کمال کے تخیل کے ڈانڈے میدان کربلا سے جا کر ملتے ہیں۔ان کی شاعری کربلائی تشبیہات، لفظیات اور استعاروں سے عبارت ہے۔ان کی شاعری میں اخلاقی پہلو خاص طور سے جلوہ گر ہے۔ان کی شاعری کی ایک خصوصیت اس کی سادگی اور پرکاری بھی ہے۔ان کے بعض اشعار تو اتنے زیادہ مقبول ہوئے کہ زباں زد خاص و عام ہو گئے اور اسٹیکرز کی شکل میں دیواروں پر آویزاں کئے گئے۔ان کے اشعار سے ان کے شعور کی بالیدگی اور فکری رو کا اندازہ بہ آسانی لگایا جاسکتا ہے:

خیال رکھنا کہ مسجد کہیں اداس نہ ہو
یہ انتظار میں رہتی ہے ہر اذان کے بعد

.....

ہاتھوں کو کشکول بنا کر آنکھیں دریا کرتے ہیں
مانگنے والے اپنے رب سے ایسے مانگا کرتے ہیں

.....

پتہ نسب کا کہاں رنگ و بو سے ہوتا ہے
یہ تجزیہ و فقط گفتگو سے ہوتا ہے

.....

ماں کے چہرے کی ابھی اور تلاوت کرلیں
جس سے معبود ہو راضی وہ عبادت کرلیں

.....

صبر ہمیشہ ظلم کے سر کو نیچا کر ہی دیتا ہے
نورِ سحر تاریکیِ شب کو رسوا کر ہی دیتا ہے

.....

اہل حق باطل زادوں کو یوں ہی رسوا کرتے ہیں
دریا قدموں میں ہوتا ہے پیاس پہ قبضہ کرتے ہیں

.....

ہو سچا عشق تو سجدے سے سر مشکل سے اٹھتا ہے
اگر اٹھتا بھی ہے تو نیزۂ قاتل سے اٹھتا ہے

.....

بہت کٹھن ہے یہاں خود کو معتبر رکھنا
کوئی مذاق ہے شانوں پہ اپنے سر رکھنا

.....

امیر شہر کے بیدار ہو جانے کا خطرا ہے
ہمارے سر کو نذر دار ہوجانے کا خطرا ہے

.....

مری پرواز پر کچھ لوگ حیرانی میں رہتے ہیں
بڑے نادان ہیں خود ہی پریشانی میں رہتے ہیں

.....

کرب ایسا کہ رسولوں نے بھی محسوس کیا
تم نے آسان سمجھ رکھا ہے ہجرت کرنا

.....

بھائی سے اختلاف میں شدت کبھی نہ ہو
اتنا نہ دور جا کہ تری واپسی نہ ہو

.....

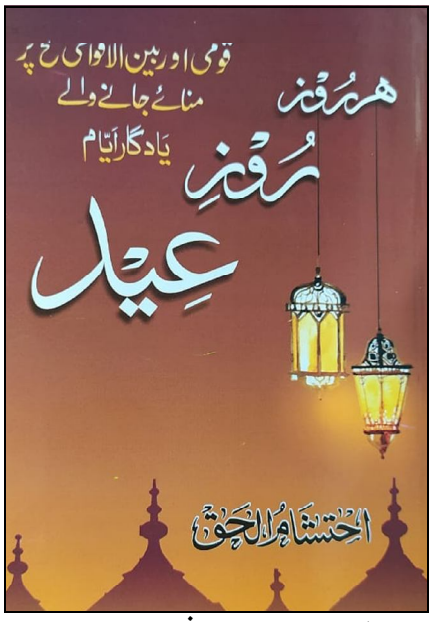
یہ مسائل کی کڑی دھوپ بھی کیا ہوتی ہے
اس میں کچھ دیر کوئی ٹھہرے تو بوڑھا ہو جائے

.....

نئی کالونیاں یوں ہی کوئی آباد ہوتی ہیں
غریب شہر جا کر پہلے ویرانے میں رہتے ہیں

نام کتاب : ہر روز روز عید

مصنف : احتشام الحق
ضخامت : 248 صفحات
قیمت : 250/روپے
ناشر : ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی
مبصر : ابرار احمد اجراوی
فون : 9910509702



شعر و شاعری، تنقید اور سوانح پر ہر روز اردو میں کتابیں چھپ رہی ہیں، ناول وافسانہ کے مجموعے بھی برق رفتاری سے منظر عام پر آرہے ہیں، مگر غیر ادبی موضوعات کے صحن میں سناٹا پسرا ہوا ہے۔ ٹیکنالوجی اور اطلاع کی صدی اکیسویں صدی میں بھی غیر ادبی علمی جہات پر اردو میں کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ بہت سست رفتار اور مایوس کن ہے۔ علمی، فنی، سائنسی اور تاریخی کارآمد عناوین ہماری نگہ تالیف کی طرف بصد شوق دیکھ رہے ہیں۔ اگر اس عہد قحط الرجال میں کوئی شخص علمی، تجرباتی اور تاریخی موضوعات کو مس کرے تو شعری اور افسانوی مجموعوں کی بادِ صرصر سے ہمارے اذہان کو کچھ نجات مل جاتی ہے۔ فعال و متحرک صحافی اور اردو کے معلم احتشام الحق کی زیر نظر کتاب 'ہر روز روز عید' بادِ بہاری کا خوش گوار جھونکا ہے، جس سے علم و معلومات کے جہان میں افزائش کی راہ کھلتی ہے۔ اس کتاب میں قومی اور بین الاقوامی سطح پر منائے جانے والے منتخب یادگار ایام کا تحریری مرقع پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اردو میں عام معلومات سیاسی، سماجی، تاریخی، جغرافیائی اور عمرانی موضوعات پر مبنی مطبوعہ مواد تو ملتا ہے، مگر ایک خاص موضوع یعنی اہم اور مشہور ایام کے تذکرے پر مشتمل کتابی پیش کش سے اردو کا سرمایہ اب تک محروم تھا۔ مغربی زبانوں خصوصاً انگریزی میں تو ہر قسم کا اچھا برا مواد مل جاتا ہے، مگر اردو علمی موضوعات کے معاملے میں ہمیشہ مفلسی پر شکوہ سنج رہی ہے۔ فاضل مصنف نے ان ایام کے پیمانے میں مختلف شخصیات، تحریکات، رجحانات، ایجادات اور دریافت سے متعلق تاریخوں کا ایسا نگار خانہ سجایا ہے جو دامن دل کو کھینچتا ہے اور نئی معلومات کا در وا کرتا ہے۔

کتاب میں قومی اور بین الاقوامی سطح کے 343 ایام کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ کتاب یوں بھی اہم ہے کہ مشمولہ ایام میں صرف تاریخی، معاشرتی اور عام قسم کے ان ایام کو شامل کیا گیا ہے، جس پر کسی خاص مذہب یا عقیدے کی چھاپ نہیں ہے۔ ان ایام کے ذکر سے اجتناب برتا گیا ہے جو مذہبی تہواروں یا مخصوص ادیان کی تقریبات کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ریاستی سطح پر منائے جانے والے ایام کو بھی کتاب کے نقشہ سے باہر رکھا گیا ہے، صرف بہار کی مناسبت سے دو ایام یعنی ''یوم بہار'' اور ''بہار یوم ارض'' کو استثنائی خانے میں رکھا گیا ہے اور ان کے تعارف اور تقریبی و تاریخی پس منظر سے قارئین کو آگاہ کرایا گیا ہے۔

نئے سال کی آمد یکم جنوری سے لے کر دسمبر تک ۳۶۵ دنوں کے عرصے میں جن اہم اور مشہور ایام کا ذکر آیا ہے، ان میں سے چند اہم ایام یہ ہیں، جن پر تفصیلی مواد فراہم کیا گیا ہے۔ یوم غیر مقیم ہندستانی، یوم نوجوان، یوم افواج، یوم حب الوطنی، یوم بنات، یوم رائے دہندگان، یوم جمہوریہ، یوم انسداد جذام، یوم الشہداء، یوم سرطان، یوم ریڈیو، یوم سماجی انصاف، یوم مادری زبان، یوم مرکزی مصنوعات، یوم سائنس، یوم خواتین، یوم گردہ، یوم حقوق صارفین، یوم شمس-ارض، یوم جنگلات، یوم آب، یوم موسمیات، یوم تپ دق، یوم کتب اطفال، یوم صحت، یوم آگہی، یوم کتاب، یوم مخالفت مزدوری اطفال، یوم مزدور، یوم آزادی صحافت، یوم مادر وغیرہ وغیرہ۔ اس کے بعد ضمیمہ کے طور ۳۱ ایام کو شامل کیا گیا ہے، جس پر مختصر پیراگراف وکی پیڈیا وغیرہ کی مدد سے لکھا گیا ہے۔ ان میں بھی بہت سے ایسے ایام ہیں جو تاریخی اعتبار سے یادگاری اہمیت کے حامل ہیں اور جن کا اہتمام قومی اور بین الاقوامی سطح پر کیا جاتا ہے۔

کتاب دور حاضر کے مشہور ادبا، ناقدین اور محققین و اسکالرس کی ستائشی تحریروں سے خالی نہیں ہے۔ ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی، پروفیسر انیس صدری، پروفیسر ایم۔ نہال، ڈاکٹر عین رشید نے اس کتاب کی ترتیب و تقدیم پر مثبت رائے کا اظہار کیا ہے اور اردو کے ذخیرۂ کتب میں اس کتاب کو کار آمد اضافہ قرار دیا ہے اور یہ امید ظاہر کی ہے کہ یہ کتاب طلبہ، اساتذہ اور اسکالرس سبھی کے لیے مصدر و مرجع ثابت ہوگی۔

کتاب کا اردو ہندی مشترکہ ٹائٹل دیدہ زیب ہے، کاغذ بھی معیاری ہے اور طباعت بھی بہت صاف ستھری ہے۔ امید ہے کہ مصنف کی دیگر کتابوں کی طرح ان کی اس تحقیقی کاوش کی علمی حلقوں میں پذیرائی ہوگی۔

☆☆

بقیہ: میر انیسؔ: ایک تعارف

سبک ہو چلی تھی ترازوئے شعر
مگر ہم نے پلاّ گراں کر دیا
مری قدر کر اے زمین سخن
تجھے بات میں آسماں کر دیا

انیسؔ کے طولانی مسدس مرثیے کہلاتے ہیں، لیکن ان میں وہ وسعت و جامعیت ہے کہ شاعری کی دوسری صنفیں ان کے سامنے بہت محدود نظر آتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ معنوی حیثیت سے یا تاثرات کے اعتبار سے شاعری کی جتنی قسمیں کی جاسکتی ہیں انیسؔ کے مرثیے ان سب پر حاوی ہیں۔ شاعری جذبات کی ترجمانی ہو یا خیالات کی، وجدان کی تعبیر ہو یا حیات کی، تخیل کی جولاں گاہ ہو یا محاکمات کی، اس کا مقصد فنی حسن کی تخلیق ہو یا انسانی اخلاق کی تکمیل، سکونِ قلب کی تحصیل ہو یا کسی پیغام کی تبلیغ مختصر یہ کہ شاعری کی جو تعریفیں کی گئی ہیں، اس کے جو محاسن قرار دیے گئے ہیں، اس کے جو مقاصد بیان کیے گئے ہیں، ان سب کے اعتبار سے انیسؔ کے مرثیوں کا شمار اعلیٰ درجے کی شاعری میں ہوگا۔ ایسی جامع صنف سخن انیسی مرثیے کے سوا اور کون ہے؟

مطالب کی بلندی و خیالات کی پاکیزگی کے ساتھ انیسؔ کی زبان میں جو شگفتگی اور بیان میں جو دل نشینی ہے اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ انہوں نے اپنی زبان کے بارے میں سچ کہا ہے:

سچ ہے کہ اس زباں کو کوئی جانتا نہیں
جو جانتا ہے ، اور کو وہ مانتا نہیں

انیسؔ کی زبان جن محاسن کا گنجینہ ہے ان کو ہر سخن شناس محسوس کر سکتا ہے۔ لیکن اس کی ایک خوبی ایسی ہے جو دوسری اہم تر خوبیوں میں دب جاتی ہے اور وہ ہے صنائع لفظی و معنوی کا حسن استعمال۔ انہوں نے جتنی صنعتیں جس کثرت اور جس سلیقے سے استعمال کی ہیں ان کی نظیر کسی دوسرے شاعر کے یہاں نہیں مل سکتی۔

انیسؔ نے جہاں مرثیے کے مضامین میں تنوع اور زبان میں وسعت پیدا کی ہے، وہاں اس کے اثر کا دائرہ بھی بہت وسیع کر دیا ہے۔ مرثیہ اپنی تاریخ کے ابتدائی دور میں صرف بعض مخصوص عقائد رکھنے والوں کو متاثر کر سکتا تھا لیکن اب وہ ہر خیال، ہر مذہب، ہر ملت اور ہر ملک کے لوگوں کو اس طرح متاثر کر سکتا ہے جس طرح ہماری شاعری کی کوئی دوسری صنف نہیں کر سکتی۔ اگر دوسری زبانوں میں ترجمہ کر کے دوسرے ملک والوں کی نگاہ میں اردو شاعری کی عظمت قائم کرنا ہو تو انیسؔ کے مرثیے ہی اس مقصد کو پورا کر سکتے ہیں۔

مرثیے کی بنیاد ایک تاریخی واقعے پر قائم ہے۔ اس لیے دلوں پر یقین کا اثر جو وہ پیدا کر سکتا ہے، وہ خیالی واقعات سے ممکن نہیں۔ پھر واقعہ بھی ایسا عظیم اور اتنا دردناک کہ دنیا کی تاریخ اس کی نظیر پیش نہیں کر سکتی۔ واقعۂ کربلا صرف حسینؑ اور یزید کی جنگ نہیں ہے، حق و باطل، نیکی اور بدی، انسانیت اور بہیمیت کی جنگ ہے۔ بلکہ حق کی حمایت اور انسانیت کی حفاظت کے لیے انسان کی سب سے بڑی قربانی ہے۔ انیسؔ نے اس قربانی کی تشریح اور اس کی قدر و قیمت کی توضیح جس خوبی سے کی ہے وہ انہی کا حصہ ہے۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے فلسفیانہ بحثیں کر کے صرف ترقی یافتہ دماغوں کے اطمینان کا سامان بہم نہیں پہنچایا بلکہ انسانی کرداروں کے بولتے چالتے مرقعے پیش کر کے دلوں کو اس طرح متاثر کیا ہے کہ معمولی فہم و ادراک والے انسان بھی بلا ارادہ اور بغیر خواہش و کوشش کے انیسی تعلیم سے مستفید ہو سکتے ہیں۔

انسانیت کے بلند ترین معیار کو پیش نظر رکھ کر جس پر اثر اور عملی طریقے سے انیسؔ کے مرثیے نیکیوں کی تعلیم دیتے ہیں، اس کی مثال کہیں اور نہیں مل سکتی۔ خواجہ حالی فرماتے ہیں ''جس اعلیٰ درجے کے اخلاق ان لوگوں نے مرثیے میں بیان کیے ہیں ان کی نظیر فارسی بلکہ عربی شاعری میں بھی ذرا مشکل سے ملے گی۔'' حقیقت یہ ہے کہ شریف ترین جذبات کی تحریک میں کوئی دوسری تصنیف انیس کے مرثیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ انیسؔ کے مرثیے زندگی کے تصور میں وہ رفعت پیدا کر دیتے ہیں جو کسی اور چیز سے ممکن نہیں۔

علامہ شبلی نے 'موازنۂ انیس و دبیر' میں، خواجہ حالی نے 'مقدمۂ دیوان' میں اور امیر احمد علوی نے ''یادگار انیس'' میں، انیسؔ کی عظمت کا دل کھول کر اعتراف کیا ہے۔ لیکن ایک طبقہ جس کو کلام انیسؔ کا مطالعہ کرنے کا موقع نہیں ملا ہے اس میں یہ غلط فہمی اب تک موجود ہے کہ انیسؔ ایک مخصوص فرقے کے مذہبی شاعر ہیں۔ حقیقت ہے کہ انیس نہ کسی مذہب کی تبلیغ کرتے ہیں، نہ کسی مذہب کی تردید، اگر ان کو کسی مذہب کا مبلغ کہا جائے تو وہ مذہب انسانیت ہے جس کی بالواسطہ تبلیغ ہر عظیم شاعر کے کلام کی امتیازی خصوصیت ہے۔ محسن اردو سر تیج بہادر سپرو نے سچ کہا ہے کہ ''انہوں (انیسؔ) نے اپنی نظموں کے موضوع کو علوئے تخئیل اور شدت جذبات سے اس طرح گراں بار کر دیا ہے کہ ان کا اثر صرف ان کے ہم مذہب افراد تک محدود نہیں رہ سکتا۔''

میر انیسؔ نہایت خوش آواز تھے اور جتنے خوش آواز تھے اس سے کہیں زیادہ خوش بیان تھے۔ تعشق لکھنوی جن کے مرثیوں اور غزلوں کی زبان میں وہ دل کشی ہے جو بہت کم شاعروں کو نصیب ہوتی ہے وہ خوش بیانی میں انیسؔ کو کل شاعروں پر ترجیح دیتے ہیں۔ ان کا قول ہے:

اگرچہ اور تعشق تھے کہنے کو ہم عصر
مگر انیسؔ سا کوئی نہ خوش بیاں دیکھا

خوش آوازی اور خوش بیانی کے علاوہ سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ مقرر کی آواز کا اتار چڑھاؤ، چہرے کا تغیر، آنکھوں کی گردش، اعضا کی حرکت یہ سب چیزیں موقع اور محل کے مناسب ہوں۔ انیسؔ میں یہ وصف حد کمال تک موجود تھا۔ جن لوگوں نے ان کو مرثیہ پڑھتے سنا ہے وہ معترف ہیں کہ وہ اپنے سحر آفریں طرز خواندگی سے سامعین کے دل و دماغ پر چھا جاتے تھے، جہاں چاہتے تھے ان کو ہنسا دیتے تھے اور جہاں چاہتے تھے رُلا دیتے تھے۔ میر انیسؔ کے کمال مرثیہ خوانی پر نظر کر کے بعض لوگوں نے قیاس کر لیا کہ وہ آئینہ سامنے رکھ کر مرثیہ پڑھنے کی مشق کرتے تھے۔ لیکن اب سے چالیس سال پہلے میرے استفسار پر معمر اور معتبر شاہدوں نے اس قیاس کو بے بنیاد بتایا۔

میر انیسؔ نے اردو شاعری کا خزانہ ایسے بیش بہا جواہرات سے بھر دیا ہے جن کی تابناکی امتداد زمانہ کے ساتھ بڑھتی جا رہی ہے اور بڑھتی جائے گی۔

میر انیس نے قمری حساب سے 72 برس چند مہینے اور شمسی حساب سے 71 برس کی عمر میں پنج شنبہ 29 شوال 1291ھ مطابق 10 دسمبر 1874 کو قریب شام انتقال کیا اور جمعہ کی صبح سے کچھ پہلے اپنے باغ میں دفن ہوئے، جہاں ان کا خوبصورت اور شاندار مزار اس وقت تعمیر کی آخری منزل میں ہے۔ ☆☆

نازشؔ پرتاب گڑھی

عیش کرتی تھی، سلامی، صفِ اعدا کیا کیا
اور تڑپا تھا محمدؐ کا نواسہ کیا کیا
رہے راضی برضا سیدؑ والا کیا کیا
دشت سے ورنہ اُبل سکتے تھے دریا کیا کیا
جب لکھا فرد شہادت پر حسینؑ ابن علیؑ
تو مشیت کا قلم ہاتھ میں کانپا کیا کیا
لے کے اصغرؑ کو جو مقتل سے پھرے شاہِ اممؑ
دل پہ گزرا ہے گراں پھول سا لاشہ کیا کیا
سجدۂ شکر الگ، ماتم ہر لمحہ الگ
کام انجام دیے شاہؑ نے تنہا کیا کیا
قتل بیٹے بھی ہوئے بھائی بھتیجے بھی ہوئے
بنت حیدرؑ نے مگر خود کو سنبھالا کیا کیا
تجھ کو اے کرب و بلا یاد رہے گا تا حشر
صبر اولادِ پیمبرؐ نے دکھایا کیا کیا
خاک پر ایک بھی آنسو جو گرا دیتے حسینؑ
حشر ہو جاتا پھر اس دہر میں برپا کیا کیا
قاسمؑ و عونؑ و محمدؑ سے جیالے نہ ملے
ڈھونڈھنے کو فلکِ پیر نے ڈھونڈا کیا کیا
شانِ حق گوئی و بے باکی و عزم و جرأت
ابن حیدرؑ نے بڑھائی تنِ تنہا کیا کیا
نہ ملا حرؑ کے سوا حق کا طرفدار کوئی
فوج اعدا میں رہے یوں تو شناسا کیا کیا
کربلا والوں کا ایثار، کہ ہمت، کہ خلوص
دو ہی آنکھیں تھیں بھلا دیکھتی دنیا کیا کیا
سن سکا اتنا کہ نازشؔ بھی مداح حسینؑ
جانے دنیا نے اسے اور کہا تھا کیا کیا

ایڈیٹر — مہدی عباس حسینی
سب ایڈیٹر — نند کشور وکرم
ماہنامہ 'آجکل' (جون 1975، انیس نمبر)

وفیات

بھیگے ہوئے کاغذ کے شاعر: ممتاز راشد

عروس البلاد ممبئی کے دورِ جدید میں ایک امتیازی شناخت کے حامل اردو کے مقبول شاعر (78 سالہ) **ممتاز راشد** 23 اپریل 2022 کی صبح انتقال کر گئے۔ ممتاز راشد 1944 میں پیدا ہوئے، ان کا تعلق اجمیر (راجستھان) سے تھا۔ وہ 1967 میں ممبئی آئے اور وَسئی، بھنڈی بازار میں قیام رہا۔ ہمارے ناقص حافظے کے مطابق 1968 یا 1969 میں ماہم (ممبئی) کی ایک پرائیویٹ شعری نشست میں ہم نے انھیں سنا تھا، ترقی پسندوں سے قبل عروس البلاد میں ایک سے مشاق اور صاحبِ فن شاعر اور ادیب موجود تھے۔ اس دَور میں شاعری و ادب سے دلچسپی مہذب ہونے کی ایک علامت تھی، مشاعروں اور قوالی وغیرہ کی محفلیں اردو معاشرے کا وقار و حسن تھیں۔

ماہم کی مذکورہ شعری نشست میں سرتاج رحمانی، محمود سروش، قیصر الجعفری، ظفر گورکھ پوری، منصور فریدی، سنجر مدراسی، چھیلا بدنام پوری، آوارہ سلطانپوری، جمیل مرصع پوری، شمیم بریلوی، نوالکھنوی، شوق سالکی لکھنوی اور ضمیر کاظمی وغیرہ جو ممبئی کے مشاعروں کے روح رواں سمجھے جاتے تھے سب شریک تھے۔ اسی نشست میں ممتاز راشد سے ہم متعارف ہوئے تھے۔ ضمیر کاظمی نے ایک مضمون میں اس مشاعرے کی آنکھوں دیکھی لکھی ہے جس میں ممتاز راشد کا ذکر یوں ہے:

''وقار لکھنوی کی صدارت میں مشاعرہ تھا جس میں اس دَور کے اکثر معروف شعرا شریک تھے۔ اناؤنسر نے ایک نئے اور نامانوس شاعر کو پکارا۔ بوٹے سے قد کا دبلا پتلا، بکھرے ہوئے گھنے بالوں، اداس آنکھیں اور پتھریلے چہرے والا ایک خوش لباس نوجوان جس کی عمر مشکل سے 24-25 برس رہی ہوگی وہ مائک پر آیا بھاری اور پہاڑی آواز والے شاعر نے ترنّم سے ایک غزل چھیڑی، آواز اور اشعار کے رومانوی لب و لہجے کی شگفتگی نے تمام اہلِ محفل کو چونکا دیا۔ اپنے وجود میں کھوئی کھوئی سی منتشر شخصیت کی کشش نے ہر شخص کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ مشاعرے پر ایک نامعلوم سحر طاری ہو گیا وہ شعر پڑھ رہا تھا:

کیا ہوا، گر اس کا پیراہن نہ رنگیں کر سکے
خونِ دل کو صَرف کرنے کے لیے صحرا تو ہے

داد کا غلغلہ اٹھتا رہا اور لوگ محظوظ ہوتے رہے۔ وہ شاعر تھے ممتاز راشد۔ میں اسی مشاعرے میں ان سے متعارف ہوا تھا۔ جوانی کے گنگناتے ہوئے بہتے آبشاروں کو ایک دوسرے سے تعارف کی ضرورت نہیں ہوتی اس کی اپنی کشش ہی ہر شے سے اپنا تعلق خود بخود استوار کر لیتی ہے۔ میرے ساتھ ابراہیم مقبول اور وفا اعظمی بھی تھے۔ ہم سب تقریباً ہم عمر تھے۔ چند لمحوں میں بے تکلف ہو گئے۔ ممتاز راشد کی شخصی انفرادیت اور غزل گوئی کی اپنی شناخت نے بہت جلد ممبئی کے ادبی منظر نامے میں اپنا مقام بنا لیا۔

چند برس پہلے جب غزل گائیکی کا زریں دور شروع ہوا جس میں پنکج ادھاس، جگجیت سنگھ، راج کمار رضوی جیسے گلوکاروں کو خوب شہرت ملی اسی دور میں ممتاز راشد کی غزلیں بھی انہی غزل گائیکوں کے ذریعے عام ہوئیں۔ ممتاز راشد کا یہ شعر تو:

کوئی تحریر مٹائیں تو دھواں اٹھتا ہے
دل وہ بھیگا ہوا کاغذ ہے کہ جلتا ہی نہیں
بہت دور تک سفر کرتا ہوا پہنچا

ممتاز راشد کے اوّلین شعری مجموعے کا نام (بھیگا ہوا کاغذ) اسی شعر سے ماخوذ ہے جو 1978 میں طبع ہوا تھا۔ کوئی دو دہے بعد ان کا دوسرا شعری مجموعہ ''خدا باقی رہے'' شائع ہوا۔ ممتاز راشد کا یہ شعر بھی لوگوں کی یادداشت میں ہے:

مَیں وہ مٹّی ہوں جو ہے چاک کی گردش میں اسیر
تو اگر ہاتھ لگا دے تو سنور جاؤں گا

ممتاز راشد کے ہاں شعری غنا اپنے پورے حسن کے ساتھ ہمیں متوجہ کرتا تھا۔ انہوں نے مشاعروں میں ترنم کو تو ایک مدت ہوئی تیاگ دیا تھا مگر ان کا تحت اللفظ بھی منفرد تھا وہ شعر کا پہلا مصرع دو تین بار نہیں بلکہ ''ساڑھے تین بار پڑھتے تھے'' اور پھر یکبارگی دوسرا مصرع اپنے سننے والوں کے درمیان کسی گولے کی طرح اچھال دیتے تھے، پھر داد کا شور ہوتا تھا اور ان کے چہرے کا سپاٹ پن۔

انھیں مشاعروں ہی میں نہیں بلکہ عام گفتگو میں بھی سنتے وقت لگتا تھا کہ وہ بہت عجلت میں ہیں مگر ان کی شعری گفت میں عجلت نہیں بلکہ ایک ٹھہراؤ بھی محسوس ہوتا تھا۔

ممتاز راشد کو بزرگانِ دین سے بڑی عقیدت تھی اور کیوں نہ ہوتی کہ ان کا اس دیار سے تعلق تھا جو حضرتِ خواجہ معین الدین چشتیؒ سے نسبت رکھتا ہے، وہ ماہم میں حضرت مخدوم ماہمی کی درگاہ کے احاطے میں ایک طویل مدت تک مقیم رہے، پھر وہ یہاں سے اٹھ کر مغربی مضافات (ممبئی) کے متمول علاقے ''لوکھنڈ والا'' (اندھیری) چلے گئے اور آج وہیں سے اُن کا جسدِ خاکی چار بنگلہ قبرستان لے جایا گیا۔ چونکہ وہ ایک مدت سے صاحبِ فراش تھے، کوئی بیس بائیس دن ایک نجی اسپتال کی خصوصی نگہداشت کے شعبے میں رہے، پھر انھیں گھر لے آیا گیا جہاں ہفتہ کی صبح کوئی آٹھ بجے انہوں نے آخری سانس لی۔ جب انھیں مٹی دینے کے بعد سوگواران قبرستان سے باہر نکل رہے تھے تو مشہور شاعر حسن کمال پہنچے۔ عرفان جعفری اور عبید اعظم اعظمی جو ممبرا سے تدفین میں شرکت کے لیے سہ پہر تین بجے نکلے تھے کہ راستے میں انھیں خبر ملی کہ تدفین ہو گئی تو وہ دونوں سیدھے ان کے گھر پہنچے جہاں ڈاکٹر قاسم امام اور قمر صدیقی وغیرہ بھی آئے ہوئے تھے۔ اطلاع کے مطابق ممتاز راشد کی بیوہ محترمہ میرا شیراز بھی شدید علیل ہیں، ان کے بیٹے فواد اور بیٹی نتاشا نے لوگوں سے اپنے والد کے لیے دعائے مغفرت اور والدہ کے لیے دعائے صحت کی درخواست کی ہے۔

(مرسلہ: ندیم صدیقی)

معروف بزرگ شاعر **ساغر وارثی** شاہجہاں پور میں انتقال کر گئے۔ ان کی عمر 84 برس تھی۔ 4 اپریل 2022 کی شام انہیں غمگین ماحول میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ شہر کے محلّہ ایمن زئی جلال نگر میں رہنے والے ارشاد احمد خاں ساغر وارثی گزشتہ 6 ماہ سے علیل تھے۔ پیر کی صبح پونے نو بجے انہوں نے اپنے گھر میں آخری سانس لی۔ پسماندگان میں اہلیہ روشن آرا بیگم، تین بیٹے پرویز احمد، گلریز احمد، دلشاد احمد اور ایک شادی شدہ بیٹی فرح جبیں وغیرہ ہیں۔ ساغر وارثی یکم اگست 1938 کو ایمن زئی جلال نگر میں ضمیر احمد خاں کے یہاں پیدا ہوئے تھے۔

انہوں نے اپنی شاعری کا آغاز 1956 میں کیا۔ وہ استاد عابد مینائی کے شاگرد تھے۔ ساغر وارثی کے کئی شعری مجموعے شائع ہوئے۔ (باقی 54 صفحہ پر)

پبلی کیشنز ڈویژن کی اردو مطبوعات

آسان پنچ تنتر حصہ1	وشنو پربھاکر/افتخار احمد خان	160/=
آسان پنچ تنتر حصہ2	وشنو پربھاکر/سید ضیاء الرحمٰن غوثی	175/=
رانی لکشمی بائی	ششی شرما/سید ضیاء الرحمٰن غوثی	55/=
ہوگی جیت ہماری	سنجیو جیسوال 'سنجے'/افتخار احمد خاں	175/=
دادابھائی نوروجی	آر پی مسانی/فرحت عثمانی	245/=
راجندر پرساد	کالی کنکر دتہ	325/=
مجاز: شخص اور شاعر	پروفیسر ارتضیٰ کریم	135/=
شہیدوں کے خطوط	ادارہ	155/=
علی سردار جعفری حیات اور تخلیقی جہات	پروفیسر علی احمد فاطمی	155/=
جہانِ رومی	مرزا عبدالباقی بیگ	100/=
خزینۂ غالب	مرتب: ڈاکٹر ابرار رحمانی	130/=
سفینۂ غالب	ادارہ	95/=
آئینۂ غالب (طبع دوم)	ادارہ	75/=
گنجینۂ غالب (طبع دوم)	ادارہ	60/=
گرونانک سے گروگرنتھ صاحب تک	ڈاکٹر مہیپ سنگھ/سید ضیاء الرحمٰن غوثی	250/=
مدن موہن مالویہ	سیتارام چترویدی/فرحت عثمانی	100/=
گاندھی کی معنویت	خواجہ غلام السیدین/نجم السحر ثاقب	55/=
آجکل اور پریم چند	مرتب: ڈاکٹر ابرار رحمانی	210/=
1857: جنگ آزادی کا درخشاں باب	مرتب: ڈاکٹر ابرار رحمانی	135/=
اٹھارہ سوستاون کی جنگ آزادی	سریندر ناتھ سین	120/=
قلم، قلم کار اور کتاب	عبدالغنی شیخ	110/=
آجکل اور غبارِ کارواں	ادارہ	170/=
آجکل کی کہانیاں	ادارہ	162/=
آجکل اور سفرنامہ	ادارہ	105/=
آجکل اور صحافت	ادارہ	115/=
آجکل کے ڈرامے	ادارہ	125/=
آجکل کے مضامین	ادارہ	112/=
آجکل اور اقبال	ادارہ	95/=
آجکل اور طنز و مزاح	ادارہ	112/=
اردو ادب کے پچاس سال	ادارہ	95/=
افسانہ آجکل	مرتب: عابد کرہانی	90/=
اٹھارہ سوستاون	سریندر ناتھ سین/خورشیدہ پروین	556/=
ہندوستانی عوام کی مختصر تاریخ	ایچ آر گھوشال	140/=
بھارتیندو ہریش چندر	(ادارہ)	130/=
ہمارا قومی پرچم	لیفٹیننٹ کمانڈر کے وی سنگھ	110/=
کلاسیکی موسیقار	مترجم: خورشید اکرم	137/=
عوام الناس کے لیے گائڈ	مترجم: عادل صدیقی	145/=
مہاتما گاندھی	آچاریہ کرپلانی/لکشمی چندر یاس	300/=
مہاتما بدھ کی حکایتیں	پال کاروس/مسعود فاروقی	155/=
شہیدوں کے خطوط	ادارہ	110/=
قلی قطب شاہ	نریندر لوتھر/زبیر رضوی	280/=
یادیں مجاہدین آزادی کی	نوین جوشی/راحت جبیں	180/=
غالب بہ صدانداز	تشکیل: برجندر سیال	1000/=
پہیلیاں-امیر خسرو	مرتب: شہباز حسین، نند کشور وکرم	22/=
کاغذی ہے پیرہن	عصمت چغتائی	65/=
کشمیر کی لوک کتھائیں	جے۔این۔گنہر	45/=
ہندوستانی تہذیب کا مسلمانوں پر اثر	ڈاکٹر محمد عمر	127/=
راگ راگنیوں کی تصویریں	شکیل الرحمٰن	325/=
ہند اسلامی طرز تعمیر	ضیاء الدین ڈیسائی/اختر الواسع	54/=
ہندوستان میں اسلامی علوم کے مراکز	ضیاء الدین ڈیسائی/بہار برنی	54/=
ہماری تہذیبی وراثت	راجندر پرشاد، بی این پانڈے	50/=
ہندوستان کے عظیم موسیقار	شمبھو ناتھ مشرا/رئیس مرزا	65/=
سروجنی نائیڈو	تارا علی بیگ/لکشمی چندر یاس	125/=
حکیم اجمل خاں	ظفر احمد نظامی	75/=
سردار ولبھ بھائی پٹیل	آئی جے پٹیل/یعقوب یاور	95/=
مختار احمد انصاری	مشیر الحسن/فرحت احساس	80/=
رفیع احمد قدوائی	ڈاکٹر ہاشم قدوائی	60/=
سرسید احمد خاں	خلیق احمد نظامی/اصغر عباس	35/=
حسرت موہانی	ڈاکٹر خلیق انجم	50/=
مولانا آزاد (طبع دوم)	عرش ملسیانی	40/=
بدرالدین طیب جی	اے جی نورانی/راجندر انجم	70/=
مظہر الحق	قیام الدین احمد، جٹا شنکر جھا	55/=
ڈاکٹر ذاکر حسین	ماجدہ اسد	120/=
رابندر ناتھ ٹیگور	ہرن مے بنرجی/اشہر ہاشمی	80/=
جواہر لال نہرو	ایم چلاپتی راؤ/کے بی شرما	105/=
روشنی کے مینار	مرتب: شہباز حسین	25/=
ہم ایک ہیں (دوسری بار)	عرش ملسیانی	90/=

نوٹ : کتابیں اور رسالے منگوانے کے لئے رقم بشکل ڈرافٹ بنام ڈی جی پبلی کیشنز ڈویژن پیشگی ارسال کریں۔

ملنے کا پتہ : بزنس ونگ، پبلی کیشنز ڈویژن، سوچنا بھون، نئی دہلی۔ 3

مراسلات

● ماہنامہ 'آجکل' اپریل 2022 کا پرچہ ملا۔ دل خوش ہوگیا۔مضامین ایک سے ایک بہتر ہیں۔'اردو ماس میڈیا' حسن ضیاء کا بہترین اداریہ ہے۔بہت دنوں قبل یہ بات پڑھی تھی کہ امریکہ کے پروفیسر اپنے اسٹوڈنٹ سے سگریٹ مانگ لیتے ہیں۔ملک زادہ نے بھی امریکی روایات کو برقرار رکھا ہے۔نیر مسعود صاحب ابن صفی کے ناولوں کے رسیا تھے۔ان کے اس خیال سے متفق ہونا مشکل ہے کہ منظوم تخلیقات کا ترجمہ تقریباً ناممکن ہے۔

عبدالمجید ھانگل
ضلع ہاویری، کرناٹک

● اپریل 2022 کا شمارہ موصول ہوا۔'آجکل' میں بیشتر تحریریں قابل مطالعہ ہوتی ہیں اور معیار کا یہ لحاظ مذکورہ شمارہ میں بھی نظر آتا ہے۔اسی شمارہ میں 'نیر مسعود کی شخصیت کے چند پہلو' کے عنوان سے شعیب نظام کا مضمون پڑھ کر جی خوش ہوگیا۔میں انہیں مبارکباد پیش کرتا ہوں اور آئندہ بھی ادب کی بڑی شخصیات پر مبنی تخلیقات کا انتظار رہے گا۔یادرفتگاں میں حسین الحق پر عبدالصمد کا مضمون بھی قابل ستائش ہے۔

شاھد اختر
227/2، جوہالی لال کالونی، کانپور

● اپریل کا 'آجکل' زیر مطالعہ آیا۔ڈاکٹر شعیب نظام نے نیر مسعود پر نہایت عمدہ مضمون قلم بند کیا ہے۔نیر مسعود کی پوری شخصیت اور ان کے علمی کمالات مرعوب کرنے کے بجائے متاثر کرتے ہیں۔یادرفتگاں کے تحت شائع چار وں مضامین نے متاثر کیا۔حسین الحق اور ابراہیم اشک سے میری رسم وراہ تھی۔اللہ پاک مرحومین کی مغفرت فرمائے اور ان کے درجات بلند کرے۔منظومات کے تحت شائع راشد طراز، بدنام نظر اور تشنہ اعظمی کی غزلیں اچھی لگیں۔''روز نیزوں سے سروں کو کیا جاتا ہے قلم'' یہ مصرع حیرت میں ڈالتا ہے۔سر تیغ وشمشیر سے قلم کیا جاتا ہے، نیزوں سے نہیں۔راشد طراز سے سہو ہوا ہے۔کرشن گوتم کی غزل کے بیشتر اشعار اور مصرعے ناموزوں ہیں۔تضمین بر غزل شمیم کرہانی کے لیے شاہد ساگری کو مبارکباد۔اردو ماس میڈیا کے عنوان سے تحریر کردہ اداریہ انتہائی متوازن اور بصیرت افروز ہے۔'آجکل' جیسے بڑے رسالہ سے اس قسم کے اداریے کی امید کی جاسکتی تھی۔

خالد عبادی، پٹنہ

● ماہنامہ آجکل ہر ماہ وقت پر موصول ہوتا ہے اور اس میں ہر مضمون قابل دید اور قابل مطالعہ ہوتا ہے، جس کے لیے خصوصاً نسائی ادب اور اردو صحافت کے دو سال جیسے اہم گوشوں سے مزین مارچ کا شمارہ قابل ذکر تھا۔

ڈاکٹر محمد یاسین گنائی، کشمیر

☆☆☆

بقیہ: وفیات

جن میں غزل کا مجموعہ ارتقا (2002)، آہنگ دل (2006)، نعتیہ مجموعہ نغمہ ونور (2015) غزل کا مجموعہ فکر کی نقاشیاں (2018)، دیوان تنظیم (2021) وغیرہ شامل ہیں۔ان کے علاوہ انہوں نے کئی شاعروں کی غزلوں کے مجموعے بھی مرتب کیے۔دوردرشن اور آل انڈیا ریڈیو کے علاوہ انہوں نے کئی آل انڈیا مشاعرے بھی پڑھے۔اردو ادب کے لیے ان کی خدمات پر کئی تنظیموں کی جانب سے انہیں اعزاز سے بھی نوازا گیا۔شام 5:30 بجے انہیں سوگوار ماحول میں ایمن زئی جلال نگر واقع قبرستان میں سپرد خاک کردیا گیا۔

☆علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کی سینئر فیکلٹی ممبر **پروفیسر سیما صغیر** کا 28 مارچ 2022 کو نئی دہلی کے ایک اسپتال میں مختصر علالت کے بعد انتقال ہوگیا۔اے ایم یو کے وائس چانسلر پروفیسر طارق منصور نے کہا کہ پروفیسر سیما ایک مخلص استاد تھیں جنہوں نے بہت سارے طلبہ کی مدد کی اور انہیں صحیح راستے پر چلایا۔یونیورسٹی کمیونٹی ان کے سوگوار خاندان کے دکھ میں شریک ہے۔انہیں دوست، ساتھی اور طلبہ بہت یاد کریں گے۔

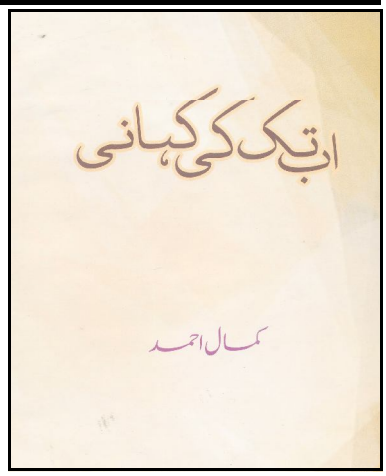
اپنی تعزیت میں پروفیسر محمد علی جوہر (چیئرمین شعبۂ اردو) نے کہا کہ وہ بے مثال اور متاثر کن شخصیت کی مالک تھیں، وہ بہترین لوگوں میں سے ایک تھیں اور ہم بہت خوش قسمت ہیں کہ انہیں بطور ساتھی پایا۔پروفیسر سیما کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔پروفیسر سیما نے 15 سے زیادہ کتابیں تصنیف کیں اور ان کے متعدد مقالے شائع ہوئے ہیں۔

پروفیسر سیما کو یوپی اردو اکادمی ایوارڈ (2004)، یوپی اردو اکادمی ایوارڈ (2010)، بہار اردو اکادمی ایوارڈ (2011)، یوپی اردو اکادمی ایوارڈ (2012) اور یوپی اردو اکادمی کی طرف سے لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ (2016) ملا۔انہوں نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور یو جی سی کے بہت سے منصوبوں پر کام کیا اور اے ایم یو گزٹ اور آرٹس فیکلٹی جنرل سے وابستہ رہیں۔اردو افسانہ اور ترجمہ ان کے اہم شعبے تھے۔مرحومہ کے پسماندگان میں شوہر پروفیسر صغیر افراہیم اور بیٹی ہیں۔

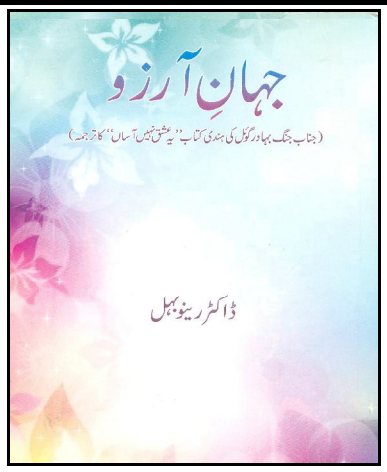
☆دہلی کے بزرگ صحافی اور شاعر **سالک دھامپوری** کا دل کا دورہ پڑنے سے 11 اپریل 2022 الشفا اسپتال نئی دہلی میں انتقال ہوگیا۔وہ 72 سال کے تھے اور بہت سرگرم تھے۔پسماندگان میں اہلیہ کے علاوہ تین بیٹے اور دو بیٹیاں شامل ہیں۔تدفین شاہین باغ قبرستان میں ہوئی۔مرحوم تقریباً 50 برسوں سے مسلسل لکھنے پڑھنے میں مصروف تھے۔انہوں نے ہندی ہفت روزہ 'کانتی' سے اپنے کریئر کا آغاز کیا تھا اور پوری زندگی ترجمہ نگاری، مراسلہ نگاری اور دیگر اصناف میں طبع آزمائی کرتے رہے۔انہوں نے درجنوں کتابوں کے ترجمے کیے اور کئی کتابیں تصنیف بھی کیں۔سالک صاحب کا تعلق دھامپور سے تھا اور زندگی کا بیشتر حصہ دہلی میں گزارا۔وہ ایک عرصہ تک ممبئی میں بھی رہے۔ان کا اصل نام مشتاق احمد تھا اور وہ سالک دھامپوری کے قلمی نام سے لکھتے رہے۔

ادارہ مرحومین کیلئے دعائے مغفرت اور پسماندگان کیلئے صبر جمیل کی دعا کرتا ہے۔ ☆☆

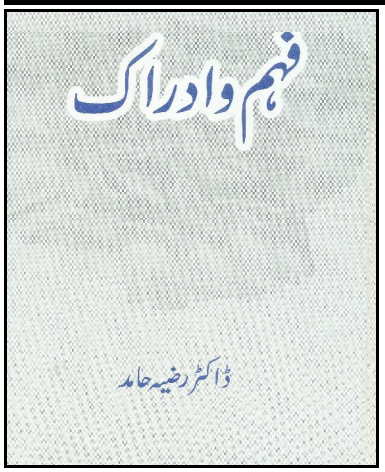
کتب موصولہ / رسائل وجرائد



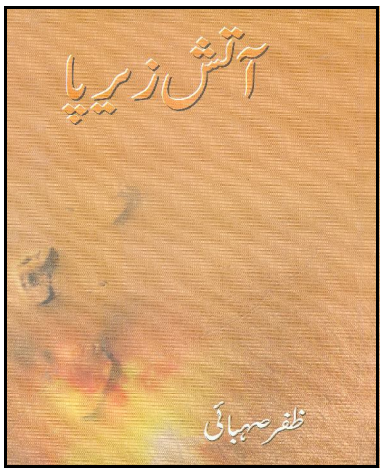
اب تک کی کہانی
مصنف: کمال احمد
ادیبہ پرنٹرس، کولکاتا۔14



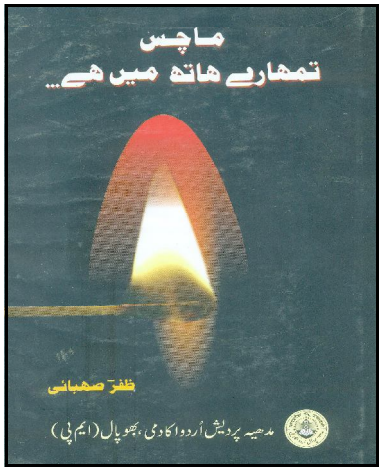
جہانِ آرزو
مصنفہ: ڈاکٹر رینو بہل ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس
D1/16، انصاری روڈ، دریا گنج، نئی دہلی۔110002



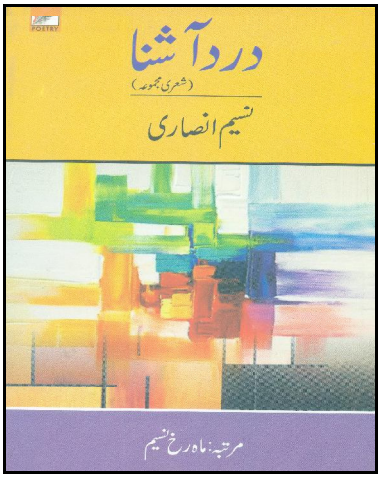
فہم وادراک
مصنفہ: ڈاکٹر رضیہ حامد
شبد پرنٹنگ پریس، نورمحل، بھوپال۔1



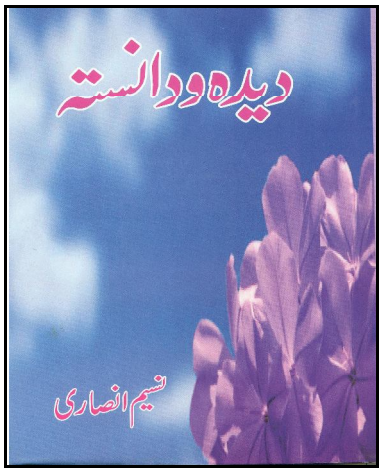
آتش زیر پا
شاعر: ظفر صہبائی
10/C165، گلی نمبر 12، عارف نگر، پیرسیہ روڈ، بھوپال



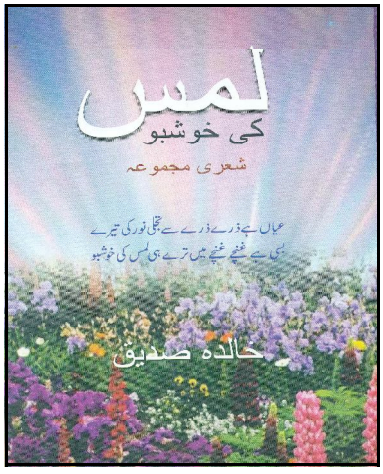
ماچس تمہارے ہاتھ میں ہے .....
شاعر: ظفر صہبائی
10/C165، گلی نمبر 12، عارف نگر، پیرسیہ روڈ، بھوپال



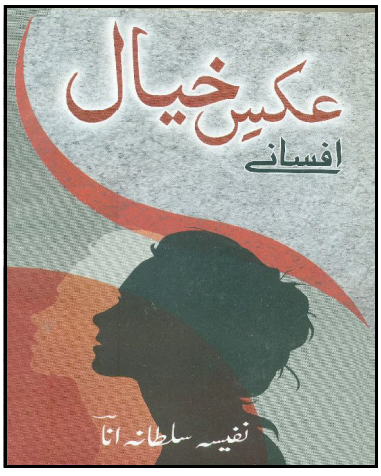
درد آشنا
شاعر: نسیم انصاری مرتبہ: ماہ رخ نسیم عرشیہ پبلی کیشنز
A-170، گراؤنڈ فلور۔3، سوریہ اپارٹمنٹ، دلشاد کالونی، دہلی



دیدہ ودانستہ
مصنف: نسیم انصاری
منشی حسین خاں ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ، بھوپال



لمس کی خوشبو
شاعرہ: خالدہ صدیق
سینٹ ماریہ اسکول، 76 اشوک وہار کالونی، بھوپال



عکس خیال (افسانے)
مصنفہ: نفیسہ سلطانہ آنا
B-122، فضا ہومس، ہاؤسنگ بورڈ کالونی، کوہ فضا، بھوپال

Regd.No. D.L. (S)05/3198/2021-23
RNI No 948/57 (Delhi Post)
Date of Publication 12-13 May 2022
Date of Posting 15-16 May 2022

AJKAL (Urdu)
Vol.80 No.11
JUNE 2022

Licensed U (DN) 50/2021-23 to post
without pre-payment at RMS Delhi
Rs. 22/- Annual Rs. 434
ISSN 0971-846X

अब प्रिंट संस्करण और ई-बुक संस्करण उपलब्ध

भारत 2022



भारत के प्रांतों, केंद्रशासित प्रदेशों,
भारत सरकार के मंत्रालयों और विभागों तथा
नीतियों, कार्यक्रमों और उपलब्धियों की
आधिकारिक जानकारी देने वाला
वार्षिक संदर्भ ग्रंथ

मूल्य: प्रिंट संस्करण ₹ 330/- ई-बुक संस्करण ₹ 248/-

पुस्तकें खरीदने के लिए प्रकाशन विभाग की
वेबसाइट : www.publicationsdivision.nic.in और मोबाइल ऐप Digital DPD पर जाएं

ई-बुक एमेज़ॉन और गूगल प्ले पर भी उपलब्ध

देश भर में प्रकाशन विभाग के विक्रय केन्द्रों और
पुस्तक विक्रेताओं से भी खरीद सकते हैं

ऑर्डर के लिए संपर्क करें :
फोन : 011-24367260
ई-मेल : businesswng@gmail.com
हमारी पुस्तकें ऑनलाइन खरीदने के लिए
कृपया www.bharatkosh.gov.in पर जाएं।

प्रकाशन विभाग
सूचना एवं प्रसारण मंत्रालय,
भारत सरकार
सूचना भवन, सी जी ओ कॉम्प्लेक्स,
लोधी रोड नई दिल्ली -110003
वेबसाइट : www.publicationsdivision.nic.in

सूचना भवन की पुस्तक दीर्घा में पधारें

@publicationsdivision @OPD_India @dpd_India

Printed and Published by **Monideepa Mukerjee,** DG, Publications Division, Soochna Bhawan, C.G.O. Complex, Lodhi Road, New Delhi-110003 Printed at M/s Multicolour Services 92 A, DSIDC Shed, Okhla Ind. Area, Phase-1. New Delhi. 110020